

**TEXT PROBLEM
WITHIN THE
BOOK ONLY**

RANJIT SINGH.

by

SIR L. GRIFFIN.

رنجیت سنگھ

ترجمہ

مولوی نظیر حسین فاروقی ۔

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_188119

UNIVERSAL
LIBRARY

سلسلہ کتابت علیہ السلام

(بی۔ اے کے لیے)

رولر ز آف انڈیا

(ہند کے حکمران)

انجمن تہذیب

(اور ہماری برہمنی ہوئی حکومت ہند اور سٹی ایشیا میں سکھوں کا حامل ہونا)

مصنف

سپیشل گورنر کے سی۔ ایس۔ آئی

مولوی نظیر حسین صاحب فاروقی

مہتمم تعلیمات ضلع راجپور (میدان)

۱۳۴۰ھ ۱۳۳۱ھ ۱۹۲۲ء

کتابت علیہ السلام علیہ السلام

یہ کتاب اکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی اجازت سے
اُردو میں ترجمہ کر کے طبع و شائع کی گئی ہے۔

فہرست مضامین

صفحات	از	تا
۸	۱	
۲۳	۹	
۴۷	۲۴	
۶۰	۴۸	
۷۷	۶۱	
۹۲	۷۸	
۱۰۹	۹۳	
۱۲۰	۱۱۰	
۱۳۲	۱۲۱	
۱۴۴	۱۳۳	

باب اول - تمہید	۱
باب دوم - سنگھ	۹
باب سوم - سکھوں کی مذہبی حکومت (یعنی ایسی حکومت جس میں اُن کے مذہب کو دخل تھا)	۲۴
باب چہارم - رنجیت سنگھ کی پیدائش کے وقت پنجاب کی حالت	۴۸
باب پنجم - مہاراجہ	۶۱
باب ششم - رنجیت سنگھ کا دربار	۷۸
باب ہفتم - رنجیت سنگھ کی فوج اور انتظام مملکت -	۹۳
باب ہشتم - اس کی ابتدائی فتوحات -	۱۱۰
باب نہم - انگریز اور آندری ستلج کا ملک	۱۲۱
باب دہم - مابعد کے فتوحات	۱۳۳
ضمیمہ -	

دیباچہ

میں نے اس کتاب میں جہاں راجہ رنجیت سنگھ کے حالات اور اُس کے زمانے کے واقعات قلمبند کرنے میں اپنی سابقہ تالیفات ”سردار ان پنجاب“ و ”راجگان پنجاب“ و ”قانون وراثت متعلق بہ والیان ریاستہائے سکھ“ سے جو قریب قریب ایک ہی مضمون کی کتابیں ہیں بہت کچھ مدد لی ہے۔ ان کتابوں کی تالیف میں میں نے اُس وقت اپنا بہت سا وقت صرف کیا تھا۔ کئی سال حالت ملازمت کے اور اسکے بعد بہت سے اوقات فرصت کے جہاں تک کہ ایک سرکاری ملازم کو فرصت مل سکتی تھی اسی کام میں صرف کیے تھے۔ اور پنجاب خاص اور علاقہ جات آرموی سٹیج کے سکھ خاندانوں اور جہاں راجہ رنجیت سنگھ کے درباریوں اور مشیروں اور امرائے فوج کے حالات بہت تفصیل سے بیان کر دیے تھے۔ اُس زمانے میں پنجاب کا کوئی شریف خاندان سکھوں کا ایسا نہ تھا جس سے میرا ذاتی تقارف نہ ہو۔ چنانچہ جو کچھ اطلاع ان لوگوں سے یا ان کی اسناد سے جو ان کے پاس محقق ملی اور سرکاری کاغذات اور عہد ناموں سے جس قدر باتیں معلوم ہوئیں ان سب کی مدد سے اُس زمانے کی ایک پوری تاریخ تیار کر دی تھی۔ اب اس کتاب کے لکھنے میں اپنی ہی سابقہ تالیفات کے مضامین کا اعادہ کرنا ایک مجبوری امر ہوا۔ سکھوں کی مذہبی حکومت کا جہاں ذکر آیا ہے اُسکا کچھ حصہ میں نے ڈاکٹر ارنسٹ ٹرمپ صاحب کی کتاب اوی کرنٹ سے اور اکثر اعداد و متاخر سنجے سنگھ کی کیفیت مردم شناری سے جس کو مسٹر ڈینزل ایبٹ سن صاحب نے بڑی لیاقت سے تیار کیا تھا لیئے ہیں۔ اس امداد علمی کیلئے میں ان دونوں لائق مصنفوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

لیپل گرن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رنجیت سنگھ

باب اول

تمہید

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد جن اشخاص نے زور پکڑا تھا ان میں رنجیت سنگھ سے زیادہ نمایاں واہم کوئی شخصیت نظر نہ آئے گی۔ یہ شخص سکھوں کی قلیل المدت سلطنت کا جولاہور میں قائم ہوئی بانی تھا۔ گزشتہ صدی کے آغاز میں ایک تلماطم و طوفان بے تمیزی برپا تھا اور اقوام و مذاہب میں باہمی کشمکش جاری تھی اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اور ہوشیاری و مستعدی اور اپنی فطرتی ذہانت و فطانت سے کام لے کر اس نے گرد و گوبند کے فتنہ پرداز اور جنگجو معتقدین کو مجتمع کر کے ایک قوم بنا دیا۔ سکھوں کی تربیت پہلے ہی سے ایسے فوجی اصول پر کی گئی جس سے زیادہ کامل طریقہ نہ تو اس سے قبل جاری تھا اور نہ اُس کے بعد ہندوستان کی دیسی ریاستوں میں رائج ہوا اور یہ جماعت رنجیت سنگھ کی سخت گیر اور جابرانہ حکومت کی ماتحتی میں ایک ایسا خوفناک اور قوی آلہ جنگ بن گئی کہ اس کے بعد وہ صرف اس وجہ سے شکستہ و کمزور ہو گئی کہ مہاراجہ کے جانشینوں نے اسے انگریزوں کے خلاف آمادہ پیکار کیا۔

جس طرح نیولین کی سلطنت کا عروج۔ اس کی کامیابی کی چکا چوند۔ اور اس کا

قطعی زوال و فتنہ ہوا تھا بعینہ وہی حال سکھوں کی حکومت کا ہوا۔ لاہور کا مہاراجہ بھی اپنے ہم عصر نپولین بونا پارٹ کی طرح راجپوتوں مسلمانوں اور سکھوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے اتحاد پر جن کو اس نے خود برباد کیا تھا کوئی دیر پا سلطنت قائم نہ کر سکا اس کے فتوحات مستحکم نہ تھے اور اس کے مقبوضات کی حالت لکڑیوں کے گٹھے کے مانند تھی جو اس کی زندگی میں اس کے زبردست ملوکا نہ غم کی بندش سے جکڑے ہوئے تھے۔ اور اس بندش کے ٹوٹتے ہی یہ مقبوضات بکھر گئے۔ اس کا تخت اس کی غلط و سطوت کی روایتیں اس کے نااہل جانشینوں کے ہاتھ میں آئیں جنہوں نے سلطنت کے جواز کو ایسا بے قابو چھوڑ دیا کہ وہ بالآخر بربادی کے پہاڑ سے ٹکرایا اور بالکل پاش پاش ہو گیا۔

اس قسم کی تاریخی مخالفت کو طول دینا بہت کچھ آسان ہے لیکن رنجیت سنگھ اور نپولین کی شخصیت و سلطنت نہ صرف ظاہری مشابہت کی وجہ سے تعجب خیز ہے بلکہ وہ اس سبب سے دلچسپ بھی ہے کہ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یکساں حالات کے نتائج ایشیا اور یورپ میں یکساں نکلتے ہیں۔ فرانسیسیوں نے اسی زمانے میں اُمر اور جاگیریت کے ظلم و بدسلوکی سے منحرف ہو کر اول اول فتح حاصل کی تھی اور وہ اس فتح مندی کے نشے میں سرشار و مخمور تھے اور سکھوں نے بھی اسی طرح ان ہی دنوں میں برہمنوں کی تباہ کن خود مختاری کے برخلاف ایک بغاوت عظیم برپا کی تھی۔ اور فرانسیسیوں کی طرح وہ بھی اس میں فتنہ ہوئے تھے۔ مشرق و مغرب کے انقلاب پسندوں کو نپولین اور رنجیت سنگھ کے مثل سردار ہاتھ لگے جو فوجی ذہانت و طباعی قطعی خود غرضی بے رحمی و بد اخلاقی میں ایک دوسرے کے بالکل مشابہ تھے لیکن جو عظمت انھوں نے حاصل کی وہ اسے اپنے جانشینوں کو ترکے میں نہ دے سکے۔ یہ سچ ہے کہ اس زمانے سے تھوڑے دن قبل ہی نپولین کی سلطنت کی تجدید کی کوشش کی گئی۔ لیکن اس تجدید کی کوشش سے اس امر کی اور بھی تصدیق ہو گئی کہ جانباز جاہ طلب اشخاص بہ آسانی کوئی حکومت قائم نہیں کر سکتے عامۂ ناس کسی ایسے سردار کی اطاعت بہ خوشی قبول کر لیتے ہیں جو لوگوں کا ڈر سرغنہ اور پیشوا ہو اور جو لوگوں کی آنکھوں میں ایسی خیرگی پیدا کر دے

کہ اُس کی ذات اُن کو مجسم ملکی شان و سطوت نظر آتی ہو۔ لیکن یہ چشم بندی اُسی شخص کی ذات تک محدود رہتی ہے اور اس کے ورثاء اور جانشینوں کی ہیئت نہیں بدلتی وہ تخت جو اُس کی قدرتی ذہانت نے قائم کیا تھا نہایت تبدیل اور بدزیب نظر آتا ہے اُس کے زینے پر ایک مجمع بے باک لالچی طفیلیوں کا جما ہوا نظر آتا ہے۔ جنہیں رعایا کو لو لکر اپنا گھر بھرنے کے سوا کوئی خیال نہیں ہوتا۔ حفظ مراتب اور اطاعت کی جگہ سازش اور بغاوت کی گرم بازاری ہوتی ہے۔ پہلے جوش و خروش ہوتا ہے پھر تحقیر کی باری آتی ہے یہاں تک کہ تھوڑی ہی مدت میں یہ خود رسلطنت فنا ہو جاتی ہے اور وہی لوگ جو اُس کی نمود کے وقت تعریفیں کرتے تھے اب اس کے خاتمے پر ہنستے نظر آتے ہیں۔ جو نبولین اور اس کے بعد اُس کے نام کی دوسری سلطنت کا حشر ہوا بعینہ وہی حالت رنجیت سنگھ اور اس کے بیٹے کھرک سنگھ اور دوسرے جھوٹے مدعیان سلطنت کی ہوئی جو شیر پنجاب کی وراثت پر آپس میں لڑ مرے ڈے

عالی شان قدیم خاندانوں کی سرنوشت اس سے کہیں مختلف ہے جن کا موروثی اعزاز نسلاً بعد نسل ایک سلسلے کی صورت میں برابر چلا آتا ہے یہ سچ ہے کہ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ایسی سلطنتیں بھی اپنے نبض جانشینوں کی بدکاریوں اور بے پروائیوں کی وجہ سے تباہ و برباد ہو جاتی ہیں لیکن ان کے سنبھل جانے کے ذرائع کس قدر وسیع ہوتے ہیں۔ وہ کمزوری کیسا سنگین جرم اور وہ حماقت کس قدر ذلیل ہے جو ایک ایسی قوم کو جن کی گرویدگی کا قائم رکھنا آسان تھا برداشتہ خاطر کر دیتی ہے! بادشاہوں کے خداداد حقوق کے متعلق کچھ ہی کیوں نہ کہا جائے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ستارے بھی اپنے دوران میں اُن کی بہبودی کے لئے ضرور کوشاں رہتے ہیں۔ اور کوئی امر من جانب اللہ اُن کا حافظ اور نگہبان ہے۔ اُن کی عزت اور محبت لوگوں کے دلوں میں ہوتی ہے جس کی منزلت صف آرا لشکر سے کہیں زیادہ ہے۔ قدامت سے لوگوں میں ایک سردار کی ضرورت کا اعتقاد اور انسان کی کمزوری اور محکوم بن کر رہنے کی خواہش ان کے تخت کی اصلی بنیادیں ہیں۔ جاننا زود دولت کی قائم کی ہوئی حکومت میں کسی وارث تخت کی ذرا سی لغزش یا چبھتا ہوا چٹکلا اُسے تاج سے محروم کر دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن وہ حاکم جس کے خاندان میں پشتہا پشت سے حکومت چلی آتی ہو

اکاش کے دیوتاؤں کی طرح کرکڑ بھلیوں پر بھی اپنا تخت جمائے بیٹھا رہتا ہے۔ اور کسی طرح کا خوف اس کا دامن گیر نہیں ہوتا۔ اس کی غلطیاں بہت جلد فراموش اور اس کی حماقتیں ایک چھوڑ سترو فہ معاف کر دی جاتی ہیں۔ اور جب ایسے حاکم کو زوال ہوتا ہے تو قسمت کی کوتاہی کے علاوہ یہ زوال زیادہ تر نتیجہ اس بات کا ہوتا ہے کہ زمانے کی ضروریات کو یہ حاکم نہ سمجھ سکا اور ایک سیاسی خود کشی پر ارادہ کر لیا۔ اگر یورپ میں یہ صورت پیدا ہو سکتی ہے تو ہندوستان میں اس سے بھی بڑھ کر صورتیں پیش آ سکتی ہیں۔ کیونکہ یہاں کے لوگوں میں قدامت پرستی اور پائے طریقوں کی پابندی اور جو پیشہ مورثوں کے وقت سے ہوتا چلا آیا ہے اس کی عظمت اس درجہ بڑھی ہوئی ہے کہ کسی حاکم کے ذاتی اوصاف پر نظر نہیں کی جاتی۔ ایسے ملک میں جہاں خونی مجرموں اور ٹھگنوں کی بھی ایک طرح پر عزت کی جاتی ہو کہ قتل و غارتہ ان کا آبائی پیشہ ہے اور جہاں وہ عورتیں بھی جن کو پاکدامنی سے کچھ واسطہ نہیں کسی نہ کسی دیوتا کی سرپرستی میں آ سکتی ہیں یہ امر ضروری ہے کہ بادشاہ کی ہیئت اور اس کی مطلق العنانی کو بادشاہی کے ضروری لوازم کا جزو اعظم شمار کیا جاوے۔ تاریخ ہند گو بادشاہوں کی مصیبتوں اور قتل کے واقعات اور شاہی خاندانوں میں تغیر و تبدل کے افسانوں سے بھری ہوئی ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو باوجود ان امور کے شاہی تعظیم کے متعلق خواہ بادشاہ کی حکومت کتنی ہی خراب کیوں نہ ہو عامۃً خلائق کا جو اعتقاد ہے اس میں کسی قسم کا تغیر نظر نہیں آتا۔ ہندوستان میں ہر زمانے میں بہت کچھ تلاطم برپا رہ چکا ہے اس کے زرخیز قطعات ملک سیکڑوں برس تک شمالی و مغربی گوشوں سے حملہ کرنے والوں کی جولا لنگاہ رہ چکے ہیں جنہوں نے ملک پر متواتر یورشیں کر کے اُسے تاخت و تاراج اور برباد کر کے روانہ ہوئے۔ اور خود اس ملک کی رہنے والی نسلیں اور قومیں ایک دوسرے کی مخالف ایک دوسرے کا قتل عام کرتی لڑتی بھڑتی چلی آئی ہیں۔ لیکن ملک کی رعایا عموماً اس خاندان کی دل سے وفادار رہی جو اس حصہ ملک میں نسلاً بعد نسل حکمران رہا اور اس کی یاوری بخت و شوخی طابع دونوں حالتوں میں اس کی حفاظت کرنے اور اس پر جان فدا کرنے پر آمادہ رہی۔ جو ریاستیں حملوں کے مدافعت کی قوت رکھتی ہیں مثلاً اودھ پور۔ جیپور اور جو دپور یا خوش قسمتی سے حمایہ آوروں کی زد سے

دور یا کوہ ہمالیہ کی اندرونی وادی میں واقع ہیں مثلاً چمپا۔ منڈی اور سکیت وہ ایسے قدیم خاندانوں کے زیر حکومت ہیں جن کا وجود زمانہ تاریخ کی ابتدا سے کہیں پہلے سے تھا اور اسی وجہ سے یہ خاندان اپنے آپ کو فخریہ سورج بنسی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اچھے جبرے۔ رحمدل و ظالم ہر قسم کے حکمرانوں کی حکومت ان ریاستوں پر رہی لیکن عامۃً خلافت نے ان سب کو قبول کیا اور کبھی بھوسے سے بھی ان کے دل میں بغاوت یا ہنگامہ آرائی کا خیال پیدا ہوا۔ غالباً یہ خاندان اس وقت بھی حکمراں رہیں گے جب انگریزوں کے ہندوستان فتح کرنے کے واقعات تاریخ قدیم کی حیثیت سے مدارس آئندہ میں زیر تعلیم ہوں گے۔ ان میں سے بعض وایان ریاست جس طرح کم شہیت و گمنام ہیں اسی طرح ان کی مالی حالت و قوت بھی کم ہے۔ ان کے قبضے میں ایک قلعہ کا کھنڈ رہے چند سو میل پہاڑ اور گھاٹی کا علاقہ ہے اور چند سو روپے اس کی آمدنی ہے اور فوج کی تو یہ حالت ہے کہ سپاہیوں کی تعداد ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ ان کا سال بہ سال محاصل وصول کر کے اپنے آپ کو برقرار رکھنا کسی مادی قوت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ ان کی حالت بعینہ اس درخت کی سی ہے جس کو ہوا کی مناسبت اور بارش نے مستحکم کر دیا ہو اور اس کی جڑیں زمین میں دور تک پھیل گئی ہوں وہ گویا قدرت کا ایک جزو لاینفک بن گئی ہیں اور مغل دوسرے موجودات عالم کے ہیں۔ ان کا قیام سادہ لوح راجپوت کا شتکاروں کے دل میں جس طرح آفتاب کی تابش سے جو ان کے کھیت کو پختہ کرتی ہے یا طوفان سے جو ان کی زراعت کو برباد کرتے ہیں بغاوت کا خیال تک نہیں آتا اسی طرح ان حکمرانوں کے حقوق حکمرانی میں کبھی کلام نہیں کرتے پڑ

ہندوستان میں اس وقت بہت سی ریاستیں ہیں جن میں سے بعض سربراہان دورہ اور مشہور ہیں۔ جن کی تاریخ برسر سری نظر لڑنے سے بھی اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ فوجی جانبازوں کے لئے کامیابی کا راستہ سخت دشوار گزار ہوتا ہے۔ حیدر آباد کی عظیم الشان ریاست کی بنا سلطنت دہلی کے (ایک دور اندیش) صوبہ دار دکن کی کنارہ کشی ہوئی (جس کی وجہ خاص یہ تھی کہ سیاسی مجبوریوں نے شہنشاہ دہلی کو چند بادشاہ گروں کے قابو میں کر دیا تھا جن کی خیر خواہی شہنشاہ کے ساتھ مشکوک تھی) بڑودہ گوالیار

اور اندور کی مرہٹہ ریاستیں اور بھوپال کی اسلامی ریاست کا قیام گذشتہ صدی میں فوجی سرداروں کی فتنہ دہی کے باعث سے ہوا جن کے اسلاف گمنام اشخاص تھے اور مہاراجگان کشمیر کا وجود تو سترہویں صدی میں سرکار انگریزی کی بددلت ہوا۔ اگر صورت حال میں یہ نہ ہوتی کہ ایک عجیب و نامعلوم آتش فشاں قوت ہندوستان کی نرم و اثر پذیر سرزمین کے طبقہ میں سرعت کے ساتھ پھیل کر موجودہ حالت میں پتھر کا سا ثبوت اور قیام پیدا نہ کرتی تو یہ ناممکن تھا کہ بن ریاستوں کو ان کے بانیوں نے اپنے زمانے میں دوسروں سے لے کر اپنا بنایا تھا ان پران کا خاندان متواتر حکومت کرتا رہتا۔ یہ قوت انگریزوں کی بڑھتی ہوئی تھی جو اٹھارہویں و انیسویں صدی کے دوران میں تدریج بڑھتی اور قوت حاصل کرتی رہی۔ انگریزوں کی فتنہ دہی خواہ بہادری کی وجہ سے ہوئی یا بمصلح۔ طاقت کی بناء پر ہوئی یا چال سے لیکن ان کے حصول کامیابی میں گو بعض اوقات رکاوٹیں پیدا ہو گئیں مگر ان میں زیادہ زمانہ نہیں گزرا۔ ہندوستان کی تمام جنگجو قومیں یکے بعد دیگرے اس نئے اور خوفناک دشمن سے مقابل ہوئیں لیکن اس دشمن نے ان کو پسپا کر کے بالکل شکستہ کر دیا جسے کہ یہ بات اظہر من الشمس ہو گئی کہ سلطنت منلیہ کی جانشین صرف برطانوی ہی قوت ہے۔ تمام ملک میں امن و امان کا ڈھنگ بچ گیا اور ایسا امن قائم ہوا کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کو چھوڑ کر ۴۴ سال سے اس میں کسی قسم کا غلغلہ اور زحمت واقع نہیں ہوا جو نواب و راجہ انگریزوں کے عنان فرمانروائی ہاتھ میں لیتے وقت برسر حکومت تھے ان کے حقوق تسلیم کر لیے گئے۔

گزشتہ راصلوات با حصول ملک کے ذرائع خواہ کچھ ہی کیوں نہ اختیار کیے گئے ہوں انگریزوں کو اس امر سے کہ کشور کشائی کا حق فاتح کو مجانب اللہ حاصل ہوتا ہے معترض ہونے یا اس بات سے انکار کرنے کی ضرورت نہ تھی کہ حق تو ریشہ تلواریں سے بھی قائم کیا جاسکتا ہے۔ بہر کیف آجکل کی دیسی باجگزار ریاستوں کی تقسیم و مختلف مدارج پر کی جاسکتی ہے۔ اولاً وہ جو بوجہ قدامت معزز اور اپنے اہالیان ملک کی پشت در پشت وفاداری کی وجہ سے مستحکم ہیں ثانیاً وہ جو انگریزی حکومت سے بھی زیادہ جدید اور ان کی بنیاد بھی دیسی ہی ہے جیسی کہ انگریزی سلطنت کی یعنی اسلامی سلطنت کا شیرازہ بکھر جانے کے باعث سے وہ صفی ہستی پر نمودار ہوئی ہیں۔ اگر کہیں ایسا وقت

پیش آئے کہ انگریز بار حکومت سے خستہ ہو کر ہندوستان سے سفر کر جائیں اور اس کا پیش کرنا ممکن ہے کیونکہ زمانے کا تغیر و تبدل سب کے لئے لازمی ہے تو اس وقت قدیم ہندو خاندان ایک طوفان عظیم میں اسی طرح محفوظ نظر آئے گا جس طرح اکثر سیلاب کے مواقع پر مٹی کے جھوڑیوں والے دیہات مع اپنے آم کے باغات کے غرق شدہ قطعے میں ابھرتے اور اونچے نظر آتے ہیں لیکن جدید خاندان جن کی بنیاد لڑائی اور غارتگری پر قائم ہوئی تھی اور جن کا نہ تو خون ان لوگوں سے ملا ہے جن پر وہ اکثر جبر حکومت کرتے ہیں اور نہ مذہب و قوم کا اتحاد ہے اور جن کی جڑیں زمین میں گڑی نہیں ہیں ان کو اپنے مقبوضات برقرار رکھنے میں پھر تقدیر کا سامنا ہو کر اسی طرح لڑنا پڑیگا جس طرح ان کے بزرگان سلف نہ کیا۔ ہل کر و گاٹیکو اڑ کو لڑنا پڑنا تھا۔

سکھوں کی حکومت کے زوال کا اصلی باعث یہ تھا کہ رنجیت سنگھ کا اقتدار شخصی تھا مگر اس کے اس اقتدار میں طاقت کا وہ ذریعہ شامل نہ تھا جو عائہ خلایق کے دلوں میں قدیم خاندانوں کی عظمت کے باعث سے پیدا ہوا کرتا ہے۔ چونکہ سکھوں ہی کی قوم سے پیدا ہوا تھا اور سکھوں کے اصول عمومیت کا ایک زندہ نتیجہ تھا اس لئے اس کے خاندان کے بقاء کی صرف ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ تھی کہ اس کے جانشینوں کو بھی اسی کی سی قابلیت و اطوار دینے میں ملتے۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس کے اکلوتے بیٹے کھڑک سنگھ کی بزدلی لا علاج تھی۔ اس کا پوتا نوہاں سنگھ جو واقعی ہونہار نوجوان تھا قتل کیا گیا اور اس کے بعد جو بد عملی کا دور ہوا تو اس کے جانشین نہ اس بد عملی کو دبا سکے اور نہ اس کو قابو میں لاسکے۔ اکثر انخاص جہا راجہ کے فرزند ہی کی حیثیت سے تخت کے دعویدار ہوئے۔ لیکن جہا راجہ کی حرم سرا کے اسرار لاہور کے بازاروں میں تنہا عام کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور ان فرزندوں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جس کا جائز اولاد ہو نا سکھوں کے نزدیک ثابت ہوتا۔ اس کے بعد انگریزوں سے لڑائی ٹھنی جس میں سکھوں کی سرکردگی ایسے بے ڈھنگے پن سے ہوئی کہ گوانھوں نے نہایت مردانگی دکھائی لیکن سب بے سود ثابت ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب پر ایک غیر قوم کی فوج قابض ہو گئی۔ اس کے حصے بخرے ہو گئے اور بالآخر اس کا الحاق عمل میں آیا۔ رنجیت سنگھ نے اکثر پیشین گوئی کی تھی وہ پوری ہوئی کہ نقشے پر انگریزوں کے مقبوضات کے خطوط جس سبز رنگ میں دکھائے جاتے ہیں وہ رنگ

ستلج سے بڑھتا ہوا بیاس تک اور وہاں سے دریائے سندھ اور افغانستان کے پہاڑوں تک جا پہنچے گا۔ دنیا میں اس بادشاہی کی یادگار جو کچھ باقی رہی وہ یہ تھی کہ اس خاندان کا ایک شہزادہ جلاوطن ہو کر سینٹ جیمس کے دربار میں حاضر رہا اور وہ ناشدنی ہیرا جس کا نام کوہ نور ہے ملکہ برطانیہ کے لوازم شہری میں داخل ہوا ہے۔

قسمت کے آگے کسی کا زور نہیں چلتا۔ اگرچہ انگریز سکھوں کے ساتھ لڑنے اور پنجاب کا الحاق کرنے کے تمام معاملے میں بالکل بے لوث تھے کیونکہ سکھ جماعت اور ان کے سرداروں کے بے انتہا جوش اور از خود فنگی سے انگریزان معاملات میں مجبور ہو گئے تھے تاہم اس میں شک نہیں کہ اگر انگریزوں سے اس وقت نمہ بھڑ نہ ہوتی اور رنیت سنگھ کے جانشین اس کی پالیسی پر عمل کر کے انگریزوں سے اتحاد پیدا کرتے تو بھی اگرچہ یہ جنگ تھوڑے دنوں کے لئے موقوف ضرور ہو جاتی مگر شمالی ہند کی اعلیٰ حکومت کے تصفیے کے لئے ایک نہ ایک دن باہم قوت آزمائی ضرور کرنا پڑتی۔ ستلج کے علاقے اور افغانستان کے ملک کے متعلق اختلاف و تنازعات کے بہت سے موقع تھے۔ سکھ نہایت خود سر اور مند مزاج تھے اور ساتھ ہی انگریزوں کو اپنا رعب و اب برقرار رکھنا بھی ایسا ہی ضروری تھا۔ ایسی حالت میں یہ ناممکن تھا کہ یہ دو فوجی قوتیں پہلو پہ پہلو امن سے زندگی بسر کرتی رہیں۔ انگریزوں کی آئندہ وقعت اور سکھ جماعت کے ساتھ ان کے آئندہ تعلقات کے لحاظ سے یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ چھوٹے چھاڑ اور جلے کی ابتدا لاہور کی طرف سے ہوئی اور کلکتہ سے اس کا آغاز نہ ہوا۔ انگریزوں کے ہندوستان پر فتح حاصل کرنے کے کارنامے میں شجاعت و مردانگی کے جوہر فتح حاصل کرنے پر تحمل اور مفتوح کے ساتھ حسن سلوک کی اعلیٰ مثالیں نظر آتی ہیں لیکن پھر بھی نبض ایسے ناکفہ بہ واقعات ہیں جو گواہ وقت کے حالات کے لحاظ سے قابلِ سفاکی تصور ہوں لیکن ایک بے رورعایت مورخ کی نگاہ میں پسندیدگی کے قابل نہیں ہیں۔ مگر پنجاب کا الحاق ان واقعات سے نہیں ہے۔ تمام سکھ جماعت نے اس فعل کو محمود تصور کیا ان لڑائیوں میں اپنی مسلم بہادری اور دشمن کو سخت نقصان پہنچانے سے شکست کا خیال جو کاشا سا کھٹکتا تھا ان کے دل سے بھل گیا۔ اور یہ لوگ ملک برطانیہ کی مشرقی مالک کی رعایا میں سب سے زیادہ وفادار بن گئے۔ ان کی جانثاری و مردانگی اکثر موقعوں پر ثابت ہوئی اور اگر ان پر اسی دشمنی اور ہمدردی سے حکومت جاری رہتی جیسی الحاق کے ابتدائی زمانے تک تھی تو وہ آئندہ بھی ایسے ہی رہتے جیسے اب ہیں اور وہ ہمیشہ انگریزی حکومت ہند کے تیغ و سپر بنے رہیں گے۔

باب دوم

سکھ

سکھ قوم جو زیادہ تر جاٹوں کی نسل سے ہے دو بڑے گروہوں پر مشتمل ہے جو ان اضلاع کے ناموں سے موسوم ہیں جہاں وہ سکونت رکھتے ہیں۔

ان میں سے ایک کا نام مانجھا ہے اور دوسرے کا نام مالوا۔ ان دونوں کی ابتدا اور تاریخ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ مانجھا باری دو آب کے جنوبی حصے کا نام ہے جولاہور اور امرتسر کے قرب و جوار میں واقع ہے بارے دو آب سے مراد وہ قطعہ ہے جو دریائے راوی اور بیاس کے مابین واقع ہے۔ مانجھی سکھوں کا اطلاق بلحاظ مناسب وسعت اصطلاح کے اس تمام گروہ پر ہو سکتا ہے جو مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے وقت دریائے ستلج کے شمال میں رہتے تھے ۛ

مالوا اٹس دریا کے بالکل جنوب میں واقع ہے۔ مذکورہ بالا مالوا کی وسعت دہلی اور بینکانیر تک ہے۔ سکھ جو یہاں سکونت رکھتے ہیں وہ یہاں کے اصلی باشندے ہیں۔ وہ یہاں لوٹ مار کے لیے آئے تھے اور نہ مانجھا سے وطن ترک کر کے یہاں آباد ہوئے تھے۔ یہی لوگ مالوا سکھ کے نام سے موسوم ہیں۔ ان کا مسلمہ پیشوا پھولکیان کا خاندان ہے جس کا سب سے بڑا قدیم مقام مہاراجہ پٹیالہ ہے۔ نابھہ۔ جمینہ۔ بھادور۔ مولہ۔ بدر روکن۔ جیون دان۔ دیال پورا۔ لہ گھریا۔ رامپور۔ کوٹ دھونا۔ کے خاندان کا اس سے قریبی اور فرید کوٹ اور کیتھل کا اس سے دور کا تعلق ہے ۛ

مالوا سکھوں کے آباو اجداد معمولی ہندو کا خستکار تھے جن میں سے اکثر راجپوت نسل کے تھے۔ سولہویں صدی کے وسط میں ان میں سے اکثر جیسٹیر سے ترک وطن کر کے یہاں آئے اور دہلی کی اسلامی حکومت کے زیر عاطفت امن دوست رعایا

۱۷۰۰ء وہ مالوا نہیں ہے جو کن پٹیالہ یعنی وہ زرخیز حصہ ملک جو زبرد کے شمال میں ہے اور جس کا وسطی ملک اندور ہے۔

کی حیثیت سے سکونت گزین ہو گئے۔ سو سال کی مدت میں جس قدر مرکزی حکومت میں کمزوری ہوتی گئی ان جاٹ سکونت گزینوں کی قوت بڑھتی گئی۔ پہلے یہ لوگ مانگڑا رہتے یعنی باوشاہی خزانے میں لگان داخل کیا کرتے تھے اور کبھی کسی طرح اس بارے سے سبکدوش ہونے کی انہوں نے کوشش نہیں کی کیونکہ کوئی سختی یا زیادتی ان پر نہیں ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ انھیں بڑی بڑی جاگیریں عطا ہونے لگیں۔ خود انہوں نے نئی بستیاں بسائیں اور اس طور پر دولت مند صاحب ثروت اور ملک میں صاحب رسوخ ہو گئے اٹھارہویں صدی کے اوائل میں مالوے کے سرداروں نے ہندو مذہب کو ترک کر کے گرو گوبند کے مذہب کی پیروی اختیار کی جو اُس زمانے میں نیا بنکا تھا گرو گوبند سکھوں کے گرووں میں سب سے آخر اور سب سے زیادہ با اثر شخص تھا۔ اس کے بعد سو سال تک بد عملی کا دور رہا۔ مسلمانوں کی عظیم شان سلطنت کا اندرونی کمزوری کی وجہ سے رفتہ رفتہ شیرازہ بکھر رہا تھا اور سکھ اپنے ان برائے نام مالکوں کی اس حالت سے فائدہ اٹھا کر یونانیوں کا اقتدار و ملک حاصل کرنے لگے۔ مسلمان فرمانروا اس جدید مذہب کی ایذا رسانی پر آمادہ ہوئے لیکن اس کا استیصال نہ کر سکے۔ اس زمانے میں سکھ مذہب کے ہاتھ میں بھی بیحد اسی طرح تلوار تھی اور وہ اسی طرح کام لیتے تھے جس طرح کہ ساتویں و آٹھویں صدی میں خود مسلمانوں اور اس صدی میں وہابیوں کے ہاتھ میں تھی۔ جو لوگ سکھ مذہب میں داخل ہوتے تھے وہ آپس میں جنگ و جدال کرنے پر بھی ہر وقت اسی طرح آمادہ رہتے تھے جیسے کہ کسی عام دشمن کے مقابلے میں تیار ہوں اور یہی وہ موقع ہوتا تھا جس میں اتفاق کرنا ان کے لئے ممکن تھا سکھوں نے علانیہ طور پر ہندو قوانین کی پیروی کو بن پر نہیں معلوم کس زمانے سے وہ عمل کرتے چلے آ رہے تھے ترک نہیں کیا اور نہ بابا نانک یا گرو گوبند کوئی ایسے قواعد مضبوط کئے جو مرہم شادی اور تقسیم ترکہ کے متعلق ان کی رہنمائی کرتے۔ لیکن ہندو مذہب کے قیود و شروط کو وہ نظر قنارت سے دیکھتے تھے اور جہاں کہیں انھیں اپنے فوری فواید کے خلاف پاتے ان پر عمل کرنے سے قطعاً انکار کرتے۔ اس وقت کی تمدنی حالت بہت پست ہو رہی تھی۔ ہر شخص کی فطرت میں جو بات اچھی معلوم ہوتی اس پر وہ کاربند ہوتا اور جس امر کے متعلق اسے یہ یقین ہوتا کہ کسی قسم کی روک ٹوک نہ ہوگی وہی اس کے نزدیک ٹھیک ہوتا تھا۔ بیواؤں اور یتیموں کا کوئی دستگیر نہ تھا کہ جابر اور دل آزار ہمسایوں سے ان کو پناہ

دے۔ یہ ہسائے ان مظلوموں کی زمینوں کو جس طرح چاہتے آپس میں بانٹ لیتے۔ چھوٹے چھوٹے سرداروں کو اپنی جائیدادیں محفوظ رکھنے کے لئے اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ بڑے بڑے خاندانوں کے محکوم اور مددگار بن جائیں اور یہ خاندان فوجی خدمت کے صلے میں ان کی حفاظت اپنے ذمے لے لیں۔ غرض اس طرح ستلج ان پار کے بڑے سرداروں کا اقتدار قائم ہوا۔ گو وہ خود مجہول النسب تھے اور ان کی جائیدادیں چھینا جھپٹی کی تھیں مگر شہنشاہ دہلی پر دباؤ ڈال کر جو اسناد و خطابات انھوں نے حاصل کئے ان سے ان کے نام اور ان کی حیثیت کو بزرگی حاصل ہو گئی۔ شہنشاہ دہلی اب تک برائے نام مالوے کا فرمانروا تھا۔ مگر اس وقت نہایت کمزوری و بے کسی کی تھی اور بجز اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ ان لوگوں کی بھی عزت افزائی کرے جس کو جانتا تھا کہ اس کی سطوت و قوت کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔

انیسویں صدی کے شروع میں ستلج اُس پار کے سرداروں پر اب وہ بلائیں نازل ہوتی نظر آئیں جو اس سے پہلے وہ اکثر دوسروں کے سروں پر نازل کیا کرتے تھے۔ رنجیت سنگھ لاہور کے مہاراجہ نے اپنی راجدھانی کے گرد و اطراف کے تمام سرداروں کو مطیع کر لینے کے بعد یہ مقصد کیا کہ ستلج کے جنوب میں دریائے جمناب تک تمام ملک فتح کرے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ قطع ملک انگریزوں سے ٹھبھیڑ ہوئے بغیر فتح ہو جائیگا۔ ستلج اُس پار کی ریاستوں کی حالت نے اس کو اپنے منصوبے میں کامیاب ہونے پر اور بھی زیادہ آمادہ کیا آپس کے بغض و عناد اور کسی باہمی رشتہ اتحاد کی عدم موجودگی کی وجہ سے اس وقت اسلامی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا وہ لوگ یکے بعد دیگرے رنجیت سنگھ کے عزم و مستعدی کے ضرور شکار ہو جاتے۔ رنجیت سنگھ کی حرص کی کوئی حد نہ تھی نہ اس کو کسی جرم کے ارتکاب سے باک تھا۔ اور عزت و رحم ایسے الفاظ تھے جن سے اس کے کان قطعاً نا آشنا تھے۔

مالو کے سردار اس خطرے سے بروقت آگاہ ہو گئے اور عین اس وقت جب کہ ان کی بربادی میں کوئی شبہ نہ ہو سکتا تھا انھوں نے انگریزوں کے سائے میں پناہ لی۔ انکی درخواست بڑے پس و پیش کے بعد قبول کی گئی۔ اور ستلج اُس پار کے ملک کا انگریزوں کے زیر حفاظت ہونے کا اعلان کیا گیا۔ اس کے بعد عرصہ تک امن و سکون رہا۔ اس مدت میں اس قوت عظیم نے جس طرح ملک کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے کا انتظام کیا اسی طرح

اندرونی امن و عافیت برقرار رکھنے پر بہت کچھ زور دیا اور بڑی سے بڑی ریاست سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے صاحب الماک شخص کی وہی عظمت و قوت برقرار رکھی جو تحت حمایت ہونے کے وقت انھیں حاصل تھی۔ اس زمانے میں جانشینی کے قواعد میں حتی الامکان موافقت و مطابقت پیدا کی گئی۔ مگر یہ امر ملحوظ خاطر رہنا چاہئے کہ یہ اصلاحیں اس قانون کو پیش نظر رکھ کر استعمال کی گئی ہیں جس کا رواج ایک خاص نوعیت کی سوسائٹی میں تھا۔ اس سوسائٹی کو جو آزادی کو مترادف خود مختاری کا سمجھتی تھی ترتیب و تنظیم کے حرکات سے آگاہ ہوئے زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا۔

۱۸۴۶ء - ۱۸۴۹ء عیسوی والی سلج کی فوجی ہم کا تقریباً وہی نتیجہ ہوا جو ۱۸۴۶ء عیسوی میں شمالی جرنی کی فوجی ہم کا ہوا تھا۔ انگریزی حکومت مدت سے جو حالات درپیش تھے ان پر تاسف کر رہی تھی اور سرداروں کے ساتھ نقص معاہدہ کئے بغیر کوئی تدبیر ان حالات کی اصلاح کی اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی وہ دیکھتی تھی کہ چھوٹے چھوٹے جابر سردار جن کو اپنی ریاستوں میں کامل اقتدارات حاصل تھے لوگوں پر کس درجہ ظلم و جبر کر کے پیسے ڈالتے تھے۔ ان سرداروں کی بدعقلی و ناشکری کی وجہ سے بالآخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ سرکار انگریزی کو جدید انتظام کی ابتدا کرنی پڑی۔ صرف بڑے بڑے سرداروں کا اقتدار برقرار رکھا گیا اور چھوٹے چھوٹے سرداروں کے اقتدارات بالکل سلب کر لئے گئے۔ اعلان ہو گیا کہ وہ صرف سرکار انگریزی کے جاگیردار ہیں ان کا تمام ملک سرکار انگریزی کے عہدہ داروں کے زیر حکومت اور سرکاری قوانین کے زیر اثر ہو گیا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مالوی سرداروں کو متعدد مدارج ترقی کے طے کرنا پڑے۔ اول ان کی حیثیت محض کاشتکاروں کی سی تھی۔ جو وطن ترک کر کے ان زمینوں پر آئے تھے اور ان میں کاشت کرتے تھے۔ اس کے بعد ان زمینوں پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ پھر اسلامی قوت سے ان کا مقابلہ رہا۔ اور اسی مقابلے کے اثناء میں قدرتی طور پر ان سرداروں کے اقتدارات بہت بڑھتے گئے۔ اس کے بعد سکون اور امن کا زمانہ آیا جس کا باعث یہ تھا کہ وہ انگریزوں کے زیر حفاظت آ گئے تھے۔ سب سے آخر دور میں ان کی تعداد و کثیر کے اقتدارات جنھیں وہ ناجائز طور پر کام میں لاتے تھے اور جن کا انھیں حاصل ہو جانا ملک کی عین بدقسمتی تھی سلب کر لئے گئے۔

مانجھا سکھوں کی تالیخ میں اس قسم کی تدبیر کی تھی کہ پتہ نہیں چلتا۔ سو برس بھی نہ گذرے ہونگے کہ ان کی جماعت کے ایک بہت بڑے حصے کی حیثیت محض کاشتکاروں کی تھی اور وہ اس قسم کے مراعات سے قطعاً مستفید نہ تھے جو ستلج اُس پار کے سرداروں کو دہلی کے دربار سے مدت تک حاصل ہوتے رہے۔ احمد شاہ اور افغانوں کے آخری حملے کے ساتھ ہی انکا اقتدار بڑھ گیا اور ہر ایسا شخص جس میں کچھ مستندی و جرات تھی لٹیروں کا ایک گروہ جمع کر کے ملک کو تاخت و تاراج کرنے لگا اور جو قطعات زمین ہاتھ لگے ان کا مالک بن بیٹھا۔ ان میں سے بہت سے سکھ ستلج اتر کر دہلی کی سرحد تک ٹوٹ مار کرتے کرتے پہنچ گئے۔ جنہوں نے ستلج اُس پار کے وسیع قطعات پر قبضہ کر لیا اور بزورِ شمشیر ان پر اپنا قبضہ برقرار رکھا۔ ان کی روش اپنے پڑوسی الموی سکھوں سے بالکل مختلف تھی یہ نارمن اُمر اس کے مشابہ تھے جو سات سو سال قبل ویلز کی سرحدوں پر اقامت گزین ہوئے تھے ۛ

پنجاب میں ستلج اُس پار سکھوں کا برسرِ اقتدار ہونا زیادہ مدت تک نہ بھٹکا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ایک ایک کر کے سب کو مغلوب کر لیا۔ رام گڑھیوا۔ بھنگلی۔ کنھیا سب بڑے بڑے گھرانے ایک دوسرے کے بعد مطیع ہوتے گئے۔ اور یہ نوبت پہنچ گئی کہ سردارِ برائے نام رہ گئی اور لاہور کے راجہ کی مرضی پر اُس کے عدم وجود کا انحصار تھا ۛ

انبالہ۔ لدھیانہ۔ جالندھر۔ ہوشیار پور۔ امرتسر۔ لاہور۔ گرداسپور۔ گجراتوالہ۔ سیالکوٹ اور فیروز پور کے اضلاع جہاں سکھوں کی سب سے زیادہ تعداد آباد ہے پنجاب کے سب سے زیادہ آباد اضلاع ہیں۔ نظم و نسق کے لحاظ سے ہر ضلع اپنی سیاسی مالی۔ اور عدالتی کارروائیوں کے لحاظ سے ایک واحد شے کی حیثیت رکھتا ہے اور چند اضلاع مل کر عوامین خصلوں کا مجموعی رقبہ جس کو قسمت کہتے ہیں نظم کی حیثیت سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں پنجاب کی چار قسمتیں انبالہ۔ جالندھر۔ امرتسر۔ اور لاہور وہ علاقے ہیں جن میں مذکورہ بالا تمام اضلاع جہاں سکھوں کی بود و باش ہے شامل ہیں اور اس امر کے باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ رنجیت سنگھ کے زمانے سے لے کر اب تک سکھوں کی تعداد کثیر کسی دوسرے ضلع سے ان اضلاع میں یا ان اضلاع سے کسی اور مقام پر منتقل ہوئی۔ یہ ممکن ہے کہ دیسی ریاست کے عروج ہونے پر تھوڑی مدت کے لئے سکھوں کی کوئی بڑی جماعت کسی دور دراز مقام سے امرتسر یا لاہور گئی ہو اور ساتھ ہی یہ بھی ممکن ہے کہ اب جو امن و امان اس علاقے میں قائم ہے اس کی بنیاد پر یہ

بننے والے ان ہی مقامات پر اور مسلمانوں کی عین بستیوں میں جہاں آج سے پچاس سال قبل وہ اپنی صورت نہ دکھا سکتے تھے رہ پڑے ہوں گے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ سکھ اکثر زراعت پیشہ ہیں اور سوائے عارضی فوجی خدمات کے وہ اپنی موروثی املاک سے جدائی گوارا نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے یہ ہوا ہے کہ سکھ آبادی کی تقسیم تعداد کے لحاظ سے مختلف مقامات میں اب بھی وہی پائی جاتی ہے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں تھی۔ یہ معلوم کرنا ناممکن ہے کہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں سکھوں کی تعداد کتنی تھی اور پنجاب کی جملہ آبادی کے ساتھ اس کا کیا تناسب تھا کیونکہ ۱۷۹۹ء کی مردم شماری سے قبل کے اعداد و شمار کا صحیح پتہ نہیں چلتا۔ ۱۷۶۵ء - ۱۸۱۷ء - ۱۸۱۹ء میں بھی مردم شماری کی گئی جن میں سے اخیر سال کے اعداد کی اشاعت اب تک نہیں ہوئی۔ تاکہ اُس سے سابق کی تعداد کا مقابلہ ہو سکے اس امر کا دریافت کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ جیسا کہ بعضوں کا خیال ہے اور ۱۸۱۷ء کی مردم شماری کی تعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ سکھوں کی تعداد میں درحقیقت کمی ہو رہی ہے یا یہ کمی محض اتفاقی و عارضی تھی۔ بظاہر بہت سے امور اس مسئلے کے تعلق قابل لحاظ ہیں۔ سکھ سے مراد مذہب ہے نہ کہ قوم۔ ہندو کسی قوم کا کیوں نہ ہو شاعر کی طرح ماورزاد ہندو ہوتا ہے۔ اس کی پیدائشی حیثیت میں کبھی فرق نہیں آتا لیکن سکھوں کی حالت بالکل اس کا عکس ہے۔ سکھ کی اولاد اس وقت تک سکھ نہیں ہوتی جب تک کہ وہ بالغ ہو کر کال بنگہ یا کسی دوسرے ایسے ہی مذہبی پاک مقام پر اس مذہب میں شریک نہ کیا جائے اور مذہبی ملتقین پاہل حاصل نہ کر لے۔ اس طور پر امیدوارانِ شریکت کی تعداد اس امر پر موقوف ہے کہ عام لوگ شریکت کو مفید یا غیر مفید تصور کرتے ہیں۔ رنجیت سنگھ کے زمانے میں جب کہ مذہبی جوش اور قومی فخر ایک ساتھ کام کر رہے تھے حاکمانہ مذہب میں داخل ہونے والوں کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی۔ سرکار انگریزی نے جب ۱۸۵۷ء میں اول مرتبہ مردم شماری کی اس وقت بیرونی اثر تنزل کی طرف مائل کرتا تھا۔ خالصہ کی قوت ایسی گری تھی کہ پھر اُس کے اٹھنے کی امید نہ تھی۔ اس کے افراد کو جدید حکام کے مزاج سے پوری واقفیت نہ تھی اور یہ خیال تھا کہ ممکن ہے کہ وہ ان لوگوں سے ناخوش ہوں جنہوں نے دولٹرائیوں پر مجبور کر کے زیر بار کیا۔ اسی وجہ سے سکھوں نے سکوت اختیار کیا اپنی اولاد کی شریکت مذہب کی رسم ادا کرنے سے باز رہے کیونکہ اس وقت توقف کر کے زمانہ کا رنگ دیکھنا مناسب تھا اور

پاہل کی رسم اس کے بعد بھی ادا کی جاسکتی تھی؛

۱۸۶۸ء کی مردم شماری کے موقع پر تہا دیں خوب اضافہ ہو گیا۔ غدر پھیل چکا تھا اور سکھوں نے ہر خوشی ہندوستان کے امن قائم کرنے میں اپنے فاختین کا ساتھ دیا تھا۔ اُن کی شرکت شکر گذاری کے قابل اور شاندار تھی۔ ہندوستان میں غالباً ۱۸۶۸ء کے غدر سے زیادہ مبارک کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس نے ہندوستان کے افق کو تمام گرد و غبار سے پاک صاف کر دیا۔ اس نے اس کاہل پیٹ بھری فوج کا وجود مٹا دیا جس نے گویا پنی سو سال کی زندگی میں اکثر کارہائے نمایاں کئے تھے لیکن اب بیکار تھی۔ اس نے ناقابل ترقی۔ خود غرضانہ۔ اور تاجرانہ طریقہ حکومت کے بجائے ایک بے رورعایت اور تہذب طریقہ حکومت کی بنا ڈال دی۔ اور اس نے سکھوں اور ان کے حکمرانوں کے درمیان رابطہ اتحاد و محبت قائم کر دیا۔ اور ان کو ایسا بنا دیا جیسے وہ آجکل نظر آتے ہیں یعنی حکومت انگلیشیہ کے سب سے بڑے معاون و مددگار بالآخر اُس نے ہندوستان بلکہ تمام دنیا پر یہ ظاہر کر دیا کہ انگریزوں میں جرات اور قومی روح ایسی ہے کہ وہ مصائب کو بیچ سمجھتے ہیں جنہوں نے کبھی یہ خیال تک دل میں نہ آنے دیا کہ اتفاقات جو ان کے موافق ہیں وہ شمار میں دو ہیں یا دس اور جنہوں نے ہمیشہ فتح کے وثوق کے ساتھ دھوا کیا جب کہ کامیابی کی توقع بالکل نہ تھی۔ غدر کے بعد سے سکھوں نے دیکھا کہ ان کے نئے حاکم انھیں مشتبه نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ ان پر اعتماد کرتے اور ان کو اپنا رفیق تصور کرتے ہیں ”سکھ“ نام کی پھر وہی وقعت ہو گئی جو ہمارا راجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں تھی۔ یہ لفظ عزت کا نشان سمجھا جانے لگا اور جو شخص اس نام سے موسوم ہوتا اس کے لئے گویا فوجی خدمات کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس طور پر اس مذہب کو از سر نو قوت حاصل ہو گئی اور سکھوں کی کثیر التعداد اولاد جن کی شرکت مذہب کے مراسم ملتوی رکھے گئے تھے اب انھیں پاہل دیا گیا اور جاٹوں اور ہندوؤں کی ادنیٰ اقوام سے بھی بہت سے لوگ اس مذہب میں داخل ہو کے ان میں مل گئے؛

اس جوش و خروش کے زمانے کے بعد قدرتی طور پر پٹشا کھایا اور ایشیہ کی مردم شماری کو ۱۸۷۱ء کی مردم شماری سے مقابلہ کرنے پر ظاہر ہوتا ہے کہ ہر مرکزی ضلع میں ان کی تعداد کم ہونے لگی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ خود تختوں کی ترتیب صحیح نہ تھی اور غلطی سے ناکی سکھ جو لفظ سنگھ اپنے نام کے ساتھ استعمال نہیں کرتے دسویں گرو گوہند کے پیروں کے

ساتھ شامل کر لئے گئے تھے لیکن سب سے بڑی وجہ ہندو مذہب کی زبردست کشش تھی جس نے امن کے زمانے میں جب کہ جنگجو خصلت کا اثر کم ہو جاتا ہے لوگوں کے دلوں پر اپنا قبضہ قائم رکھا۔ اس کی تاثیر عشق پیچھے کی بیل کی سی ہے جو ایک بار اس کی گرفت میں آگیا اُسے جکر کے دبوچ لیا اس نے تقریباً تمام مذاہب کو جیسے سکھ، اہل ہندو مذہب، پر دونوں ہندو مذہب کی اتحادی صورتیں تھیں جب برسرِ مقابلہ ہوئیں تقریباً خاتمہ کر دیا۔ مغرب میں رومی کلیسا کی جو حالت ہے وہی مشرق میں ہندو دھرم کی ہے۔ جب کہ جوار بھاٹے کی طرح اس کا جزر ہوتا ہے اور حریف مقابل اپنی فتح کا یقین کر لیتے یہ اپنی پہلی قوت کے ساتھ طوفانِ جنگ سے پلٹتا ہے۔ ہندو مذہب ہمیشہ سے سکھ مذہب کا مخالف رہا ہے کیونکہ سکھ مذہب نے اس کے اہم اصول ذات کی جو اس کی جان ہے شدت سے مخالفت کی ہے۔ اور اگر یہ اصول نہ رہے تو برہمنی نظام مردہ ہو کے زمین پر لیٹ جاتا ہے۔ سکھ مذہب پر ہندو مذہب کا اثر دو طریقے پر ہوتا ہے ایک تو بچوں کے پاہل کی رسم ادا کیے جانے سے والدین کو باز رکھنا دوسرے خود ان سکھوں کو جو ان میں شامل ہو گئے ہیں ان کے مذہب سے منحرف کرنا۔ چند رسوم بطور کفارہ ادا کرنے۔ برہمنوں کو کچھ دان دینے اور فوجی لقب کو اپنے نام سے جدا کر دینے پر سکھ پھر جاٹوں کے گروہ میں عام ہندوؤں کی حیثیت سے شامل کر لیا جاسکتا ہے۔ سکھوں میں مذہب و نام کے تبدیل نہ کرنے پر بھی جزوی معاملات میں ہندو مذہب کے اصول کی پیروی کرنے کا عام رُجھان ہے اور یہاں بھی دوسرے ممالک کی طرح عورتوں کا اثر اس معاملے میں غالب رہتا ہے۔

ہندو عورتوں کے لئے جو بالکل ناخواندہ ہوتی ہیں سکھ مذہب کے فلسفیانہ اہلیات یا گرو گوبند کی سیاسی تعلیم ہندو مذہب کی بت پرستی کے مقابلے میں زیادہ دلکش اور ان کی سمجھ سے مناسبت رکھتی ہے اور وہ ان کی مذہبی رسوم کی رنگ آمیزی کر کے جان ڈالتی ہے جو سری گرنہ کے فستروں کی جاپ سے ممکن نہیں۔ ہندو دھرم کی رسمیں ادا کرنے کے لئے وہ اپنے گاؤں کی ہجولیوں میں ہل کے باہر جاتی ہیں اور صبح کو مندر یا ان پتھروں پر جن کو سیندر لگایا ہے جہاں ٹھاکر جی کا اٹھنا ہے جو گاؤں کے نگہبان ہیں۔ ہندو دھرم کے سیکڑوں تہوار منانا دیول کا جانا ایک مہنگا۔ جو خوش اچھے اچھے کپڑے پہننا ان عورتوں کا۔ دل بہلا دے ہیں ورنہ ان کی زندگی نہایت اُداس اور ایک ہی حالت

پر رہتی ہے۔ دم اٹکتا جاتا ہے۔ صرف مذہب ہی کی آڑ میں انکی زندگی نرمی سے کٹی ہے ان عورتوں کا ہندو اور سکھ مذہب کا فرق سمجھ کے اسے قبول کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی انگلیز عورت کا ناچ کا جلسہ چھوڑ کے کوکیر فرنے کی رہبانیت کو پسند کرنا علاوہ بریں پر وہمت کا اثر خواہ وہ کیتھلک مذہب کا ہو یا برہمن عورتوں پر مردوں سے زیادہ بھاری ہوتا ہے۔ اس زندگی کی خوشحالی اور مرنے کے بعد مکت اس کا انحصار گرو کی ذات پر ہے۔ برہمن پنڈت اولاد کی امید دلانے میں وعدہ کرتے ہیں کہ سوت کی پریت اوس کے سوامی کو نہ موہے گی۔ ہندو دھرم کی رسموں کے بجالانے پر اس کی آئندہ بھلائی کا ذمہ ہے۔ مرد بھی انھیں خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے برہمنی مذہب کی روایتیں ایسی قوی ہیں کہ جدید اصلاح ان کو روک نہیں سکتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ پھر ہندو مذہب میں پلٹ کے آجاتے ہیں۔ سکھ گوتمبا کو نہ پیئے اور ڈاڑھی یا سر کے بال نہ کتر وائے مگر پھر بھی برہمن کی غلط اور اپنی قدیم مذہب کی دیویوں میں حاضر ہو کے ہندوؤں کی وہم پرستی کے رسوم بجالاتا ہے۔ ذات پات کے بارے میں سکھوں نے بہت کچھ اپنی آزادی پر قرار رکھی ہے۔ اور اگر ضرورت ہو تو وہ عیسائی یا مسلمان کے برتنوں میں کھائی سکتا ہے۔ گروہ کبھی ایسی ذات والوں کے ساتھ میل جول نہیں رکھتا جسے ہندو لوگ ناپاک تصور کرتے ہیں۔ خاکروب یا مڑبی سکھ جن کی تعداد کثیر ہے (کیونکہ ظاہر ہے سکھ مذہب زیادہ تر بیچ ذات والوں کے لئے زیادہ دلکش رہا ہے) سکھوں کے مندروں میں داخل نہیں ہو سکتے۔ سرکار انگریزی نے مجبوراً اس ذات والوں کے لئے جو اپنی اعلیٰ ذات والے ہم مذہبوں سے لڑائی کے موقع پر بہادری میں کم نہ رہے پے

فجرب ہے کہ خالصہ کے زمانہ انتہائے عروج میں بھی پنجاب کی آبادی میں بہت کم تعداد ان لوگوں کی تھی جنھوں نے سکھ مذہب قبول کیا۔ اس صدی کے ابتدائی زمانے کے مجنونانہ غلو کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمانہ مابعد میں مہاراجہ نے ایک بے مشل فوجی جماعت قائم کر لی اور ان لوگوں نے جو شمار میں ہندوؤں کی ایک ذات والوں کی تعداد سے زیادہ نہ تھے یکجہت ہو کر تمام پنجاب و کشمیر کو تاخت و تاراج کیا۔ افغانوں کو شکست دے کر ان کو کوہستان میں واپس بھیج دیا۔ اور ایک زبردست سلطنت قائم کر دی جس میں تعداد کی مناسبت ہندو مسلمانوں کے مقابلے میں ایک و دس کی تھی نہ

پنجاب کی مردم شماری باشتناؤ کشمیر ۱۸۹۱ء میں ۲ کروڑ ۲۷ لاکھ ۱۲ ہزار ۱۲۰ تھی جس میں سے ایک کروڑ ۱۶ لاکھ ۶۲ ہزار چار سو چونتیس مسلمان - ۹۲ لاکھ ۳۲ ہزار دو سو پچانوے ہندو اور ۱۶ لاکھ ۱۶ ہزار ایک سو چودہ سکھ تھے - صرف انگلیزی علاقے میں ہر دس ہزار کی عام آبادی میں ۵۹۵ سکھ یعنی ۵.۹۵٪ کی مردم شماری کے مقابلے میں جب کہ تعداد ۶۵۰ تھی ہر دس ہزار میں ۵۵ کی کمی واقع ہوئی - جن اضلاع میں سکھوں کی آبادی نسبت زیادہ ہے وہ فیروز پور - امرتسر اور لدھیانہ ہیں فیروز پور میں دس ہزار آبادی میں ۲ ہزار پانسو پچانوے - امرتسر میں دو ہزار چار سو بائیس اور لدھیانہ میں ۲ ہزار پچپن کی تعداد ہے اگرچہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں سکھوں کی آبادی نسبت زیادہ ہو لیکن غالباً وہ وسطی اضلاع میں زیادہ تعداد میں مجتمع تھی اور نالندہ کے زمانہ عروج میں بھی ان کی تعداد کبھی ۲۰ لاکھ سے زیادہ نہ تھی پڑ

دہی ریاستوں میں پنجاب کی تمام سکھ آبادی کا ایک ثلث سکونت رکھتا ہے - قدرتی طور پر ڈیالہ سب سے بڑھا ہوا ہے عام آبادی کی نسبت سے وہاں ہر دس ہزار میں دو ہزار سات سو اکاسی سکھ ہیں - ذات کے لحاظ سے ان کی تقسیم کا مسئلہ بہت دلچسپ ہے لیکن گزشتہ مردم شماری ۱۸۹۱ء کی ٹھیک تعداد معلوم کرکے کی کوشش نہیں کی گئی اب معلوم ہوا کہ اس صوبے کی مختلف قسمتوں میں ایک ہزار سکھوں میں سے چھ سو ننانوے جاٹ راجپوت سینس اور کھوہوں کی زراعت پیشہ ذات کے ہیں تلج کے جنوبی اضلاع میں اس تعداد میں نسبت زیادتی ہے - اور وہ بنیئے اور کھتری کی تجارت پیشہ ذاتوں میں ان کی تعداد ۴ فی ہزار ہے اور کمار - بافندے - لوہار - بنجار - سنار - حجام اور اسی قسم کی اہل حرفہ ذاتوں میں ان کی تعداد ۱۳۴ فی ہزار ہے اور دوسری نیچ ذاتوں میں ۹۵ فی ہزار سکھ پائے جاتے ہیں - سکھوں کے اہل حرفہ کی ذات کے لوگ تمام اضلاع میں یکساں نسبت سے پائے جاتے ہیں لیکن تجارت پیشہ سکھ مسلمانوں کے اضلاع میں زیادہ آباد ہیں - ان میں سے بعض مثلاً راولپنڈی کی قسمت میں یہی لوگ

۱۵ ایک تار برقی ہندوستان سے ، فروری ۱۸۹۲ء سکھ آبادی کی تعداد ۱۸۹۱ء کی مردم شماری ۱۸۹۱ء میں ۱۹۰۴ء میں تمام ملک میں بتاتی ہے -

سکھ آبادی کا ایک بہت بڑا جزو ہیں۔ مذہبی ذاتوں برہمن اور فقراء میں ان کی تعداد بالکل نہ ہونے کے برابر ہے۔ پنجاب کے تمام سکھوں میں ۴ فی ہزار پروہتوں کی جماعت میں شامل ہیں سکھوں کا ماخذ زیادہ تر جاٹ ہیں۔ اس ذات کی تقسیم و تقسیم بہت سے فرقوں اور قبیلوں میں ہے اور پنجاب کی تمام ذاتوں میں یہی ذات سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے۔ جاٹوں کی اصلیت اب تک کماحقہ دریافت نہیں ہوئی ہے اور اس پر بہت کچھ مباحثہ ہوتا رہا ہے۔ بعض مشہور مورخین نے انکا گیڈک نسل سے ہونا بیان کیا ہے لیکن پنجاب کے جاٹوں کی روایتوں کے لحاظ سے ان کے تمام فرقے دراصل راجپوت نسل سے ہیں اور انھوں نے وسط ہند سے پنجاب میں آکر سکونت اختیار کی تھی۔ سندھو اور وراچ جاٹ بھی جو دریائے سندھ کے پار کے باشندوں کی نسل سے ہونے کا دعوے کرتے ہیں اپنی اصلیت کے بارے میں متفق الہائے نہیں ہیں اور دونوں فرقوں کے کثیر افراد راجپوتانے کو اپنا قدیم وطن بتاتے ہیں۔ دریائے سندھ کے مغرب سے اور کسی قوم کے نقل مکان کر کے آنے کا تاریخ سے پتہ نہیں چلتا صرف سندھو اور وراچ کے بانیوں ہی کے تبدیل وطن کرنے کا پتہ چلتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ سب سے علیحدہ وطن ترک کر کے یہاں آباد ہوئے ہیں۔ پنجاب کے جاٹوں کی زبان میں بھی کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے ان کے گیڈک نسل کے ہونے کی تائید ہو سکے۔ اس مضمون کے متعلق خود میری ذاتی تحقیقات جو کسی زمانے میں بہت وسیع تھی مجھے اس امر کا یقین دلایا اور مسٹر ایٹن مردم شماری کی رپورٹ کے مولف بھی میری اس رائے سے متفق ہیں کہ جاٹ و راجپوت عموماً ایک ہی نسل سے ہیں اور موجودہ امتیاز صرف تمدنی معاشرت کی حیثیت سے ہے نہ کہ بلحاظ تقسیم اقوام۔ جاٹ تعداد میں راجپوتوں سے گنتے ہیں اور ان کی فوجی قابلیت عمدہ کا شہکار محنتی و ایماندار اور فرمانبرداری کے لحاظ سے وہ پنجاب کی اقوام میں قابل قدر و اہم فرقہ تصور کئے جاتے ہیں یہ لوگ اپنے طور طریقوں میں بالکل آزاد ہیں اور بجائے جماعت یا گروہ کے زیر اثر ہونے کے بہ نسبت اور اقوام کے وہ بہشت شخصی آزادی کے حامی ہیں۔ گو وہ موقع پر اپنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں لیکن فطرۃً وہ ظالم و کینہ پرور نہیں ہیں اور امن کے زمانے میں عمدہ رعایا اور لگان ادا کرنے والے ہوتے ہیں کیونکہ وہ صبر و استقلال و کامیابی کے ساتھ اپنا پیشہ زراعت انجام

دیتے ہیں۔ معاشرتی زندگی میں برہمن۔ راجپوت اور کھتریوں کے بعد ان کا مرتبہ تصور کیا جاتا ہے لیکن وہ خود اپنے آپ کو راجپوتوں کے مساوی اور کھتریوں سے بالاتر شمار کرتے ہیں اور گزشتہ واقعات و موجودہ حالات کے لحاظ سے ان کا یہ دعوئے قابل قبول بھی ہے۔ دریائے بیاس و ستلج کے قُرب و جوار کے اضلاع میں جہاں سکھ سکونت گزین ہیں یہ لوگ سب سے اچھی حالت میں نظر آتے ہیں۔ جنوبی اور سرحدی اضلاع میں ان کی حالت جداگانہ ہے۔ اکثر خالتوں میں ان کی اصلیت راجپوت نسل سے علیحدہ ایک اور قوم معلوم ہوتی ہے۔

اس طور پر سکھوں کی خوبیاں اور جاٹوں کی خوبیاں ایک ہی شے ہیں۔ کیونکہ سکھ اسی قوم کے لوگ ہیں۔ نئے مذہب نے ان میں ایک فوجی جذبہ پیدا کر دیا ہے جو اس مذہب کی خاص روایات میں سے ہے اور سرکار انگریزی کو ان کے اس جذبے کو برقرار رکھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ اب چونکہ سرکار انگریزی کا اقتدار ہندوستان میں یکسوئی حاصل کر چکا ہے اور سال بہ سال اس کی مزاحمت میں انحطاط ہوتا جا رہا ہے تو لازمی طور پر فوجی اقوام کو اپنے فوجی جذبات کے اظہار کا کم موقع ملتا ہے۔ ہر جگہ سپاہی کا شتکاری کے کام میں مصروف ہوتے جاتے ہیں۔ یہ لوگ تلوار کو کوٹ پیٹ کر بل کی نوک بنا لیتے ہیں اور اب ہمیں اس امر کا فخر ہے کہ سرکار انگریزی کی جے پکاری جاتی ہے گویا کہ تمام ملکی نظم و نسق کی کامیابی کا دار و مدار و انحصار اس پر تھا۔ لیکن ہندوستان جیسی سلطنت کے لئے جس کی آبادی اٹھائیس کروڑ اسی لاکھ ہے جس کو بہت سے بیرونی خطرات کا اندیشہ ہے اور جس کی ناک میں دشمن لگے رہتے ہیں اس کی سلامتی کے لئے لڑائی اشد ضروری ہے۔ تلوار ہمیشہ تیز رکھنا چاہئے اور زیادہ عرصے تک اس کو نیام میں رکھ کر زنگ آلود نہ ہونے دینا چاہئے۔ اگر ہندوستان کے حکمران واقعی دانشمند ہیں تو وہ سکھوں کی فوجی خدمات کو برقرار رکھنے میں ان کی بہت افزائی کرتے رہیں گے اور ہر موقع پر انھیں مصروف کار رکھینگے خواہ جنگ یورپ میں ہو یا ایشیا یا افریقہ میں۔ سب سے بڑی ضروری اور اہم بات یہ ہے کہ ان کو اس قسم کی فوجی تربیت دی جائے کہ وہ ہر طرح کے دشمن کی مداخلت کرنے کے قابل ہوں خواہ دشمن یورپین اقوام سے ہو یا ایشیائی۔ انگریزی فوج کی تعداد

اس درجہ کم اور اس کی نظم و ترتیب ایسی ناقص ہے کہ ہندوستان کو بظاہر بیرونی حملوں کی مدافعت کے لئے خود ہی ہر حالت میں تیار رہنا چاہئے اور اس غرض کے لئے پنجاب کی جنگجو اقوام خصوصاً سکھ کافی ہیں بشرطیکہ ان کی محفوظ فوج مصیبت پڑنے سے پہلے مرتب کر لی جائے اور اس امر کا خیال رکھا جائے کہ ان کے فوجی جذبات بالکل مردہ نہ ہو جائیں۔

سکھوں سے تکلیف مالا یطاق کی توقع رکھنا بالکل بے سود ہے۔ سرکار انگریزی کے تحت میں ان کی اصلی قدر و قیمت کا اندازہ غدر کے موقع پر ہو چکا ہے جبکہ این رو و آنروے تبلیغ کے راجاؤں پشیالہ۔ نابھ۔ جنید اور کپورتھلہ نے ہنگامے کی خبر پاتے ہی بغیر اس امر کا انتظار کئے کہ یہ شکون نیک ہے یا بد اپنی فوجوں کے ساتھ دہلی کی طرف سلطنت انگریزی کے دشمنوں پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ ان کی اس بہادرانہ مثال کی تقلید تمام صوبے کے سکھوں نے کی اور ہندوستان کا ملک ملکہ مظفر کے لئے جس طرح انگریزی سپاہ کی سنگینوں سے حاصل ہوا اسی طرح پنجابی رعایا کی سرگرمی و وفاداری سے۔ لیکن سکھ کسی عہدے پر یا منوسپل کٹیو میں کام کرنے کے لئے بالکل موزوں نہیں۔ اس امر کے ثبوت کا ذکر آگے چل کر رنجیت سنگھ کے انتخاب وزراء کے واقعات بیان کرنے کے موقع پر ہوگا۔ اسکول اور کالجوں میں بھی سکھ طلباء دوسری اقوام کے تمام طلباء سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ لیکن مشرق میں علمی مدارج کی کامیابی کسی عہدے کے لئے موزونیت کا معیار تصور نہیں کی جاتی۔ خوشامدی اور منکسر المزاج سنگالی مقابلے میں غالباً اس سے بازی لے جائیگا حالانکہ نہ تو اس میں لڑنے کے لئے جسمانی طاقت اور نہ حکومت کرنے کے لئے اخلاقی قوت ہوتی ہے۔ جو لوگ جاٹ سکھوں کی کار آمد رعایا کی حیثیت سے اس بنا پر قدر نہیں کرتے کہ وہ اپنی موروثی خصلت و تربیت کے باعث تحصیل علم کی جانب رجحان کرنے سے قاصر ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں۔ سکھ ایک جنگجو قوم ہے اور ان کے اعلیٰ اوصاف کا اظہار فوج میں ہو سکتا ہے جو ان کا قدرتی پیشہ ہے۔ وہ بہادر اور جفاکش ہوتے ہیں۔ ان کو اپنی مغلوبیت کا احساس فطرتی طور پر کم ہے۔ ضبط و تربیت کے بشدت پابند۔ اپنے افسروں کے ساتھ وفادارانہ سلوک کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ انھیں ذات پات کی پروا نہیں

ہوتی جس کی وجہ سے اکثر ہندو افواج میں انتظام برقرار رکھنے اور ہنگام جنگ ان کے خور و نوش کا بندوبست کرنے میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔ یہی وجہ ہیں جن کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مشرق میں تمام دوسری اقوام پر سپاہی کی حیثیت سے انھیں فوقیت حاصل ہے۔ ملکہ مظہ کی رعایا میں اور بہت سی جنگجو اقوام ہیں مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان سب میں سکھ سب پر قابل اعتماد اور کارآمد سپاہی ہونے کی حیثیت سے سبقت لے گئے ہیں۔ گو رکھا بھی انھیں کی طرح بہادر اور میدان جنگ میں جانناز ہوتے ہیں لیکن بد قسمتی سے ان کی تعداد بہت کم ہے اور سرکار انگلہزی کے علاقے میں یہ لوگ زیادہ تعداد میں سکونت نہیں رکھتے۔ ان میں سے اکثر نیپال کے باشندے ہیں اور بعض اوقات حالات ایسے پیش آجاتے ہیں کہ فوج میں بھرتی کرنے کے لئے اعلیٰ درجے کے افراد کافی تعداد میں دستیاب نہیں ہوتے۔

راجپوت اعلیٰ درجے کے سپاہی ہوتے ہیں گو سکھوں کا سا ان کا جسم و جوش نہیں ہوتا۔ لیکن اعلیٰ درجے کے راجپوت دستیاب ہونا دشوار ہے اور جو لوگ ہماری سلک ملازمت میں داخل ہوتے ہیں وہ اکثر مخلوط النسل پہاڑی ڈوگرے ہوتے ہیں جن کو وسط ہند کے نجیب الاصل راجپوت نظر حقارت سے دیکھتے ہیں۔ علاوہ بریں پر اعلیٰ درجے کے لوگ ہماری فوج میں اس وقت تک فریک نہ ہوں گے جب تک انھیں ذات والوں کو ان کی فوج کا عہدہ دار مامور کرنے کا کوئی انتظام نہ ہو پنجابی مسلمان۔ گکھڑ۔ اوان اور توانا اقوام کے لوگ نیز شمالی مغربی سرحد کے افغان جرگے بہادر سپاہی تو ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن اگر انھیں عرصے تک میدان جنگ میں مصروف رکھا جائے تو انھیں گھر کی یاد ستاتی ہے اور اکثر کو تو سرحد پر عبور کرنے کی ترغیب دینا ناممکن ہے۔ اور ہر حالت میں ان کو ہستانی اقوام کے لوگ طبعاً اس قدر آزاد اور خود مختار ہوتے ہیں کہ ان کو تہذیب و تمدن کی پابندیوں میں جکڑنا ناممکن ہے۔ وہ یہ مصیبت نہیں اٹھا سکتے۔ لیکن سکھ ہر حال میں یکساں ہے دیں و پردیں جنگ و امن ہر حالت میں شاد و خوش رہتا ہے جیسا وہ منظم سوار ہے ویسا ہی مستقل پیادہ اور گولیوں کی بوچھاڑ میں وہ ایسا ہی مستقل مزاج رہتا ہے جیسا کہ تلہ کر نیسے لئے وہ بے صبری ظاہر کرتا ہے۔ دیسی افواج میں صرف سکھ ہی ایسے ہیں جو تعداد کثیر میں ملک سے باہر عرصہ دراز تک

مصروف پیکار رکھے جاسکتے ہیں بشرطیکہ انھیں معقول مشاہرہ دیا جائے کیونکہ اسکاٹ لینڈ کے لوگوں کی طرح وہ بھی روپے کی قدر و قیمت سے بخوبی آشنا اور اس کے جمع کرنے کے دلدادہ ہیں۔ انھوں نے مصر-جیش افغانستان اور چین میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ انھوں نے برضاء و رغبت برائیں پولیس اور مقامی فوجی دستے میں ملازمت اختیار کی حالانکہ یہ ملک ایسا ہے جسے عام طور پر اہل ہند ناپسند کرتے ہیں۔ ہانگ کانگ میں بھی سکھوں کا پولیس کا ایک دستہ ہے اور وہاں ان کی بہت کچھ وقعت ہے اور ان پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ مسٹر جانسٹن کے ساتھ جو سرکار انگریزی کے ایجنٹ جنرل اور نیا سا بھییل پر عرب بروہ فروشوں سے برسر پیکار تھے سکھوں کی ایک جماعت محافظہ دسٹے کی حیثیت سے مامور تھی۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ بنجیدہ اور با وقعت اور مطیع اشخاص جواب ہماری فوجوں میں شامل ہیں انھیں لوگوں کی نسل سے ہیں جو وحشی ٹیڑھے تھے اور سو سال قبل شمالی ہند میں ان کے نام سے لوگ کانپتے تھے۔ لیکن یہ تبدیلی ایک طاقت ور اور مہربان حکومت کی بدولت نیز اس فوجی تربیت کی وجہ سے واقع ہوئی جو ہمدرد عہدہ داروں کی زیر نگرانی عمل میں آئی جنگی اہل فوج وقت کرتے اور ان سے مالوف و مانوس تھے۔ افغانستان کی لڑائی کے آخر زمانے میں مجھے سمجھ سکھ فوج کے طور طریق دیکھنے کے بہت سے موقعے دستیاب ہوئے۔ ان کے مصائب پر صبر و تحمل کرنے اور افغانوں کے ساتھ جو ان کے قدیم جانی دشمن تھے پسندیدہ قواعد کی پابندی کے متعلق ان کی جس قدر تعریف کی جائے بجا ہے۔

اس امر کا تصفیہ آئندہ موقع پر ہو سکیگا کہ یورپین اقوام کے مقابلے میں ان کی فوجی خدمات کس درجہ مفید و کارآمد ہو سکتی ہیں۔ مجھے اس امر کا پورا یقین ہے اور میرے اس خیال سے ہندوستان کی افواج کے اکثر ذی وقعت عہدہ دار متفق ہیں کہ سکھوں کی سپہیل اور سوار فوج اگر انگریز عہدہ داروں کے زیر نگرانی دشمن کے مقابلے پر لائی جائے تو دنیا کی ہر فوج کے ہم پایہ اور اپنے حریف مقابل سے بہتر ثابت ہوگی۔

باب سوم سکھوں کی مذہبی حکومت

ہمارا راجہ رنجیت سنگھ سکھوں کی مذہبی حکومت کا ایسا کامل نتیجہ تھا اور اس میں خالصہ کی روح اس درجہ سمائی ہوئی تھی کہ اس کی طبیعت اور کردار کا بیان ہنرگز پورا نہیں ہو سکتا جب تک اس مذہبی نظام کا تفصیلی بیان نہ کیا جائے جس نے پنجاب کے جاٹ کاشتکاروں پر اٹھارویں اور انیسویں صدی کے نصف اول میں بہت قوی اثر کیا تھا۔ یہ مضمون اس قدر وسیع اور پیچیدہ ہے کہ بیان اس کا تفصیل کے ساتھ تو کب بلکہ اس کا خلاصہ بھی قابل اطمینان انداز سے نہیں ہو سکتا۔ جن لوگوں کو سکھوں کے اصول عقاید اور اخلاق سے کما حقہ واقفیت حاصل کرنا ہو چاہئے کہ ادبی گرنٹھ یا سکھوں کے مذہبی نوشتے کا ترجمہ اصل گرنٹھی سے مع اقتتاحی مضامین ڈاکٹر ارنسٹ ٹرمپ ریس پروفیسر آف اسیٹ نے یہ اہم کام تفویض کیا تھا۔ جب ڈاکٹر ٹرمپ اس خدمت کے انجام دینے میں مصروف تھے میں گورنمنٹ کے چیف سکرٹری کے عہد پر لاہور میں تھا۔ یہ کام سخت مشکل تھا لیکن ان کے شوق محنت اور تجربہ علمی نے اس کو پورا کیا۔ ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا کہ سکھوں کے گرو اور گرنٹھی (جو ان نوشتوں کے پڑھنے اور بیان کرنے والے ہوتے ہیں) اپنے مذہب کے اصول سے ناواقف اور قدیم گرنٹھی زبان کی ترکیب اور محاورات سے نا آشنا ہیں اور مشتبہ مقامات کا جو مطلب بیان کرتے ہیں وہ بھی ایسا ہوتا ہے جو مدت سے اُن میں سینہ بسینہ چلا آیا ہے اور جو گرنٹھ کے دیگر مقامات سے اختلاف بھی رکھتا ہے۔ بہر کیف چند نادرا لوجود شرحوں کو دستیاب کرنے کے بعد جو اصل کتاب کی مثل نامکمل اور مشکل تھیں ڈاکٹر ٹرمپ صاحب نے کسی طرح اپنا کام ختم کیا۔ لیکن اس سے پہلے ان کو ایک مجموعہ لغات اور صرف و نحو خاص گرنٹھ کے متعلق تیار کرنا پڑا جس میں

گر کبھی کی ترکیبیں اور متروک الفاظ درج کئے۔ اس کام کو اٹھانے میں جو جو مشکلات پیدا ہوئیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کبھی حل نہ ہوں گی چنانچہ نوبت یہ اس جا رسید کہ ڈاکٹر موصوف باوجود میرے سخت اصرار کے لاہور چھوڑ کر چرمنی روانہ ہو گئے اور وہاں سات برس کی مسلسل کوشش کے بعد اُن کا ترجمہ شائع ہوا۔ گویہ ترجمہ عام طور پر دجسپ نہیں ہو سکتا لیکن وہ ہمیشہ ایک عالم کی جانفشانی اور علیست کی یادگار رہیگا۔ اس سے پہلے سکھ مذہب کے حالات کپتان جوزف کنگنگ ہم یا مسٹر ایچ ایچ ولسن نے اپنی کتابوں میں جو ہندوؤں کے مذہبی فرقوں کے بیان میں ہیں لکھے تھے۔ مگر یہ حالات بہت کم اور ناقص طور پر بیان ہوئے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لکھنے والے خود کوئی علم سکھوں کی مذہبی کتابوں یا ان کی شرحوں کا نہ رکھتے تھے۔ بلکہ یہ بات تو اب تک آسان نہیں ہوتی ہے کہ ادی گرنٹھ کی پیچیدہ و مشکل عبارت میں اصول عقاید کا جو نازک سلسلہ ایک سرے سے دوسرے تک چلا گیا ہے وہ پڑھنے والے کی نظر سے غائب نہ ہونے پاوے۔ ادی گرنٹھ میں اکثر معمولی امور کس کس اختلاف سے بار بار بیان ہوئے ہیں اگرچہ اُس کے بعض حصے جن میں بھگت کبیر اور بھگت فرید کے اشلوک جو گرنٹھ میں بطور تفسیر کے اضافہ ہوئے ہیں ایسے ہیں کہ اُن کے اکثر فقروں کی عبارت دل آویز اور خوشنما ہے اور گوان پر شعر کا اطلاق صحیح نہیں ہو سکتا تاہم ان میں شعر کی بہت سی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کا انداز زیادہ تر وائٹ و ٹمین امریکہ کے شاعر کے کلام کا سا ہے اور اس کے کلام سے ان کا مقابلہ مناسب ہے ۴

ادی گرنٹھ کی خاص سند بابا نانک تک پہنچتی ہے جو سکھ مذہب کے بانی تھے اور جنھوں نے سترھویں صدی کے اوایل میں اس کے اکثر مقامات تصنیف کئے۔ گروارجن نے جو سکھوں کا پانچواں گرو یا بڑا اوتار مانا جاتا ہے اسے موجودہ صورت میں مرتب کیا۔ اس نے نانک کی تحریر کے ساتھ اس کے جانشینوں اور دوسرے قدیم ہندو متصوفین کی تحریریں اضافہ کیں۔ سکھوں کے مابعد کے فوجی و ملکی دستور العمل کے حصہ و ضبط کی حیثیت سے ادھی گرنٹھ سے زیادہ گرو گوہند کی تحریریں اہم تصور کی جاتی ہیں جو سکھوں کے دسویں اور سب سے بڑے گرو مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے ۱۶۹۶ء میں ایک ضخیم کتاب مرتب کی جس میں کچھ تو خود اُن کی

ذاتی تصنیفات ہیں اور کچھ ان ہندی شعرا کی مدد سے تحریر کیا گیا ہے جو ان کے حاشیہ نشین تھے۔ اس میں قدیم متروک الاستعمال اور نہایت مشکل ہندی زبان میں اس نئے مذہب کے اصول بیان کئے گئے تھے جس کی گرو گوبند تبلیغ کرتے تھے۔ گرو گوبند نے نانک کے صوفیانہ مشرب میں کسی خاص قسم کی تبدیلی نہیں کی اگرچہ ان کی تعلیم اور عمل صریحاً ہمہ دست کے اصول پر رہا۔ وہ خود گرو گوبند کی پوجا کرتے رہے اور ہندوؤں کے دوسرے معمولی بتوں کی پرستش جاہز رکھتے تھے گو وہ خدائے تعالیٰ کی ذات واحد کی عبادت کو مہجّ مجھنے کے بھی حامی تھے ۶

اس کتاب میں اتنی گنجائش نہیں کہ دسوں گروؤں کے حالات مفصل قلمبند کئے جاسکیں۔ ان کے متعلق جو کچھ بیان کرنا ضرور ہے وہ چند ہی اوراق میں تحریر ہو سکتا ہے ۶

نانک جو اس مذہب کا بانی تھا اس کی معتبر سوانح عمری ”جنم ساکھی“ ڈاکٹر ٹرمپ نے انڈیا آفس کے کتب خانے سے ڈھونڈ نکالی۔ یہ سوانح عمری ایچ ٹی کولبرک نے انڈیا آفس کو نذر کی تھی۔ نانک ۱۵۶۹ء میں موضع تلونڈی میں پیدا ہوا تھا جو بعد میں ننکانہ کے نام سے گرو کے نام پر مشہور ہوا۔ یہ موضع شہر لاہور کے قریب دریائے راوی کے کنارے پر واقع ہے۔ وہ کھتری یا تجارت پیشہ ذات کا تھا اور گانوں کے مغز عمدہ پٹوارگری یا محاسبی پر مامور تھا۔ اس کے بچپن اور جوانی کے متعلق جیسا کہ ہر ایک کثرت سے پھیلنے والے مذہب کے بانیوں کے متعلق ہوتا آیا ہے عجیب عجیب خوارق عادات کے قصے بیان کئے جاتے ہیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زندگی عام لوگوں کی طرح کی تھی۔ اس نے شادی بھی کی اور بچے بھی ہوئے۔ ایک روز وہ دریا میں نشانہ کرنے جا رہا تھا کہ فرشتے اسے اٹھا کر خدا کے حضور میں لے گئے جہاں اسے بیشین گوئی کی قدرت عطا فرمائی گئی اور روئے زمین پر خدائے واحد کے متعلق دنیا میں منادی کا حکم ہوا۔ اس خدائی حکم کی پابندی میں نانک نے بیوی بچوں کو خیر باد کہہ کر صرف ایک چیلے کے ساتھ جس کا نام مردانہ تھا وطن ترک کیا اور فقیرانہ لباس اختیار کر کے دنیا میں اس نئے مذہب کی تعلیم دینے کے لئے شہر بہ شہر پھرنا شروع کیا۔ سکھ

وقائع نویسوں نے اس کے مشرق و مغرب شمال و جنوب اور ایک ایسے فرضی ملک کے سفر کے واقعات تحریر کئے ہیں جس کو وہ گورکھ پوری کہتے ہیں۔ جو ہندوستان میں گویا یوٹوپیا کی مثال ہے۔ لیکن ان سفروں میں جن میں بہت سے ناقابل یقین عجائبات کا وقوع بیان کیا جاتا ہے۔ کوئی ایسا اہم واقعہ بجز اس کے نہیں کہ اس بڑے گرو کی ملاقات شاہ بابر سے ہوئی اور وہ بہت مہربانی اور اخلاق سے پیش آیا۔ اس زندہ دل ذی شان فرمانروا کا حال جس حد تک ہم کو معلوم ہے اُس سے یہ کچھ بعید نہیں۔ اپنی عمر کے آخری زمانے میں بابا نانک اپنے خاندان کے لوگوں کے پاس جالندھر کے قریب موضع کرتار پور میں واپس آگیا اور ۱۵۳۹ء میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کی زندگی میں کوئی اہم واقعات پیش نہیں آئے۔ اس کا طرز زندگی عام ہندو سادھوؤں کا ساتھ اور اس کا جو اثر ہوا وہ ان تحریرات میں مدون کیا گیا ہے جو اس کے بعد کچھ اکی گئیں اس نے اپنے دونوں بیٹوں پر فوقیت دے کر اپنے چیلے انگد کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ لفظ سکھ جس کے لغوی معنی نواآسوز اور مرید کے ہیں نانک نے اپنے مریدوں کو بخشا اور جب قدر اس مذہب کی اشاعت ہوتی گئی اور یہ تمام قوم کا امتیازی خطاب ہو گیا۔ لیکن یہ امر ذہن نشین رہنا چاہئے کہ سکھ سے مراد مذہبی جماعت ہے نہ کہ کوئی خاص ذات اور اس کا اطلاق صرف ان لوگوں پر ہوتا ہے جو خالص مذہب کے پیرو ہیں۔

ارجن (پانچویں گرو نے) نانک کی تحریرات یکجا جمع کیں اور انھیں کے ساتھ مقبول عام پاک بزرگ اشخاص و شعرا کے کلام کے اقتباسات بھی اضافہ کئے۔ یہ کتاب سنسکرت زبان میں ہندوؤں کے ویدوں و پرانوں کی طرح تحریر نہیں کی گئی جس کا عام طور پر سمجھنا دشوار ہے بلکہ پنجابی زبان میں لکھی گئی جو عام بول چال کی زبان تھی۔ ادھی گرنٹھ ایک ہی اسلوب پر نہیں لکھی گئی۔ اس کے محاورات مضامین کے زمانے اور مقامات کے لحاظ سے مختلف ہیں قدیم ہندی زبان کے ذخیرے کے لحاظ سے یہ کتاب بہت زیادہ قابل قدر ہے۔ بابا نانک اور اس کے جانشینوں کی زبان اس وقت کی مروجہ پنجابی زبان کے لحاظ سے جس میں نانک کی جنم ساکھی لکھی گئی فصیح پنجابی زبان میں نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سی ہندی ترکیبیں اور الفاظ ہیں۔

غالباً مقصود یہ تھا کہ مقامی زبان کو روزمرہ کی بول چال کی بہ نسبت زیادہ با وقعت بنایا جائے اور اس کے ساتھ یہ صفت بھی قائم رہے کہ عام فہم ہو۔ گرو گو بند سنگھ کی تحریرات تقریباً بالکل خالص ہندی میں ہیں اور اس صورت میں فی زمانہ پنجابی بولنے والے سکھوں کے لئے ان کا سمجھنا بالکل ناممکن ہے۔

ادی گرنٹھ کا پہلا باب سب سے اہم اور دلچسپ ہے جو جاپو یا جاپی کے نام سے موسوم ہے۔ جس کو خود بابا نانک نے تحریر کیا ہے۔ اس میں مذہبی عقاید بیان کئے گئے ہیں۔ ادبی لحاظ سے یہ تمام کتاب کے باقی دوسرے حصوں سے بھران حصوں کے جن میں کبیر اور شیخ فرید کی صوفیانہ تحریرات ہیں ممتاز ہے اور جس کے متعلق اس سے قبل بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ بھگت کبیر کی شہرت تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے اور اب تک مریدوں کی جو کبیر پنتھی کے نام سے مشہور ہیں بنارس میں ایک خانقاہ موجود ہے جہاں کبیر پنتھ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ سب سے پہلے شعرا جن کا کلام گرنٹھ میں شامل ہے مہٹھی کے دو شاعر نام دیو اور ترلوکن ہیں جن کی زبان کی خصوصیت زمانہ حال کی مرٹھی ترکیب پر ہے اور اس سے ان کا کئی نژاد ہونا ثابت ہوتا ہے۔

گوبند سنگھ جو دسواں اور آخری گرو تھا ۱۱ سال کا تھا شاہ اور رنگ زیب نے اس کے باپ کو اذیتیں دے کر مار ڈالا۔ گوبند سنگھ بھاگ کر پھاڑوں میں جا چھپا اور اپنی تعلیم کی تکمیل میں مصروف رہا۔ علیحدت کے لحاظ سے وہ اپنے سلف سے برتر تھا۔ اسے فارسی ہندی اور تھوڑی سی سنسکرت بھی آتی تھی۔ اس نے اپنے زمانہ آخر کی تحریروں میں سنسکرت کے داخل کرنے کی کوشش بھی کی۔ ذہانت و قابلیت و مستقل مزاجی میں وہ اپنے پیش روؤں سے کہیں بڑھ کر تھا اور شروع ہی سے اپنی زندگی کا مقصد یہ قرار دے لیا تھا کہ سکھوں کو ایک مضبوط اور زبردست قوم بنائے پنجاب سے مسلمانوں کی قوت کا استیصال کر دے۔ مگر اس کا پتہ نہیں چلتا کہ باوجود اس قابلیت اور قصد کے جب تک تیس برس کے بچہ پنچاودہ اس ارادے کو

۱۱۰ سال کی عمر میں گرو گو بند سنگھ نے کبیر کی بہت تعریف کی ہے اور اس کے متعلق کہا ہے کہ خدا کے نزدیک ہے اور دنیاوی بادشاہوں سے اس کا مدد بلند تر ہے۔ اس کا نام ایک مدت بعد تک دنیا میں جاری رہیگا۔

عمل میں لانے کی طرف کیوں متوجہ نہ ہوا۔ اس وقت تک وہ تحصیل علم میں اور اس کام کی تیاری میں مصروف رہا جو اس نے اپنے ذمے لازم کر رکھا تھا۔ ورزش جسمانی سے بھی وہ غافل نہ رہا اور چونکہ اس زمانے میں یہ چیزیں شرفاء کی اولاد کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھیں۔ اس نے ان میں کمال حاصل کیا۔ جب وہ گوشہ نشینی ترک کر کے باہر نکلا سکھوں نے بلا پس و پیش اسے اپنا اصلی اور موروثی رہنما تسلیم کر لیا اور وہ اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ وہ اس کے ساتھ مل کر مسلمان ظالموں سے اس کے باپ کے قتل کا بدلہ لیں۔ مہم شروع کرنے سے قبل اس نے ہندوؤں کی دیوی درگا سے منٹ مانگی جس کا مندر زینا دیوی کے پہاڑ اس کے جائے سکونت انند پور کے قریب تھا۔ ابتدائی ضروری وسخت ریاضتوں کی انجام دہی کے بعد جو کثرت سے تھیں اور مدت تک جاری رہیں اور دودھ کھکی اور اناج چڑھانے پر دیوی نے نمودار ہو کر اپنی محافظت میں لینے کے معاوضے میں انسانی قربانی طلب کی۔ پوجاریوں نے اسے صلاح دی کہ دیوی کے راضی کرنے کے لئے اسے اپنے چار بیٹوں میں سے ایک کا سر نذر کرنا مقبول قربانی ہوگی۔ ان بچوں کی ماؤں نے قدرتی طور پر اپنے بچوں کے بھینٹ چڑھاے جانے سے انکار کیا۔ اس کے بعد گوہند سنگھ نے اپنے دوستوں سے استمداد چاہی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پانچ آدمی بھینٹ چڑھنے پر آمادہ ہوئے اور بالآخر ایک شخص جس کا نام بیان نہیں کیا گیا مندر کے روبرو قتل کیا گیا۔ باوجود اختلاف روایات اس امر میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ انسانی قربانی کی گئی۔ اگلے زمانے میں یہ خو غور دیوی جس کی مختلف صورتیں اور نام ہیں اکثر انسانی قربانی طلب کیا کرتی تھی اور صرف سرکار انگریزی کے زمانے سے جب کہ مذہب و متل کا میل مشا دیا گیا بجائے انسان کے بھیڑ بکریاں قربانی کی جانے لگیں۔ بہر حال دیوی نے بھینٹ قبول کی اور ہی خونی بھینٹ سے کام کا آغاز کرو گوہند سنگھ کی بابت کی زندگی اور ہولناک موت کی گویا فال تھی۔ اب گرو نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور اپنے پیش آئندہ کام کی نوعیت و کامیابی پر بھروسہ کر کے دلیری کے ساتھ نئے اصولوں کی تعلیم دینا شروع کی جو نانک کی تعلیم کے خلاف تھی۔ اس کی حیثیت ایک سیاسی مذہب کی تھی سکھوں میں بچہ پتی پیدا کرنا تھا تاکہ ارجن دہر گوہند کی رائے کے مطابق ایک فوجی جماعت بن جائے۔ قدیم سکھ مذہب میں اصطلاح کی قسم کی ایک رسم بھی جاری تھی لیکن وہ

اب متروک ہو گئی تھی۔ گوہر سنگھ نے اس کی تجدید کی اور اسے سکھ مذہب میں شامل ہونے کے لئے لازمی قرار دیا۔ اور اسے اپنے تمام موجودہ مریدوں کو پاہل دیا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ پانی میں شکر ڈال کر خنجر سے اس کو ہلایا جاتا تھا اور ہلاتے وقت گرنٹھ کے جاپ جی کے کچھ منتر پڑھے جاتے تھے۔ جس شخص کو داخل کرنا مقصود ہوتا وہ اس شربت کا ایک گھونٹ پیتا اور باقی شربت اس کے بدن اور سر پر چھڑکا جاتا تھا۔ اور اس وقت اصطباع دینے والا اور نو آموز مرید ”واہ گرو جی کا خالصہ پکارتے جاتے تھے“۔

گرو گوہر سنگھ نے جب اپنے پانچ چیلوں کو اس طرح اصطباع دے لیا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے کہہ کر اپنے اوپر بھی یہ رسم ادا کرائی اور سنگھ کا لقب اختیار کیا۔ خالصہ میں پانچ کی تعداد ایک خاص امتیاز رکھتی ہے اور اس سے ایک خاص عبادت کی ترکیب تصور کی جاتی ہے جس میں گرو یہ وعدہ کرتا ہے کہ اس کی روح ہمیشہ ان کے ہمراہ رہے گی۔ گرو گوہر سنگھ نے نوبیکھ لوگوں کو ہدایت کی کہ اصطباع کی رسم ادا ہونے کے بعد وہ اپنے ناموں کے ساتھ سنگھ کا لفظ استعمال کیا کریں۔ آج کل عوام کی نظر میں سنگھ ہی صرف سکھ مانے جاتے ہیں اور نانا کی سکھوں کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ پھر ہندو جماعت میں واپس گئے۔

گرو گوہر سنگھ کا دوسرا کام یہ تھا کہ سکھوں کی کتابوں کی تطبیق اپنے خیالات سے کرنے اور اس غرض سے اس نے کرتار پور کے پاک ٹھہر میں ادی گرنٹھ کے محافظین کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ اسے گرنٹھ میں اضافہ کرنے کی اجازت دیں۔ لیکن سودھیوں نے جو سکھ پوجاری اور اس مذہبی کتاب کے محافظ تھے اور جو گرو رام داس کی اولاد سے تھے اس جدید رہنما کی پیشوائی قبول کرنے سے انکار کیا۔ ان لوگوں کی اور انند پور اور کرتار پور کے عمال کی حالت سکھ مذہب کے برہمنوں کی سی ہو گئی تھی اور برہمنوں کی طرح ان میں بھی بے انتہا

۱۔ ڈاکٹر ٹرپ نے لفظ خالصہ یعنی سکھ سلطنت کے نام کے اشتقاق کے متعلق دوسرے علماء سے اختلاف کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ خالصہ دراصل عربی لفظ خالصہ ہے۔ اور اس کے معنی کسی شخص کی ذاتی جاگیر کے ہیں۔ چنانچہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ گرو یا خدا کی ذاتی جاگیر تھی۔

دعوائے روحانیت کا تباہی پیدا ہو گیا تھا۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ گرو گوبند نانک کی تعلیم سے بھی زیادہ مساوات پیدا کرتا اور سب سے نیچے ذات کے لوگوں اور جو لوگ ذات باہر ہو گئے تھے اُن کو برہمنوں کے مساوی کرنا اور خالصہ مذہب کے حقوق دینا چاہتا ہے تو فوراً برسرِ خنادر ہو گئے۔ انھوں نے گوبند سنگھ کو جھوٹا مدعی قرار دیا اور اس کے خلاف مذہبی تعلیمات کے اس پاک مذہبی کتاب میں اضافہ کئے جانے کی اجازت دینے سے انکار کیا جو ان کی سپردگی میں تھی۔ ان لوگوں نے اُسے طعنہ دیا کہ اگر وہ پٹیا گرو ہے تو خود کوئی کتاب کیوں نہیں مرتب کرتا۔ گرو گوبند نے ایسا ہی کیا اور ۱۹۶۷ء میں اس کی کتاب مرتب ہو گئی۔ اس کتاب کی ترتیب میں بابا نانک سے جو تعلیم جلی آتی تھی اُس کو نسخہ یا اُس میں کوئی اہم ترمیم کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ایک جدا گانہ تصنیف کی گئی جس سے اس کی جلد برافروختہ ہونے والی طبیعت اور مذہباً پیروں کی ایسا کرے جو اُس کا مقصود تھا کہ وہ ایک فوجی قوت میں جو مسلمانوں کے خلاف ترتیب دی گئی تھی لگا دیئے جائیں اور اس مذہب کے مستفیدین کے لئے پنجاب کو چھین لیں۔ وہ اس کوشش میں کسی حد تک کامیاب ہوا اور فدائیوں کی روز افزوں جاعت کے ساتھ اس نے نئے مذہب کی اشاعت کا کام آغاز کیا جو اس کی زندگی کا منشا تھا۔ سب سے پہلے اس کا مقابلہ کانگڑے کی پہاڑیوں کے راجپوت سرداروں سے ہوا جنھوں نے اپنی تمام قوت کو مجتمع کر کے اندپور کے مقام پر اس پر دھاوا کرنا چاہا۔ ایک لڑائی میں جو چمکور کے قریب ہوئی اور جو مقام اب تیرتھ گاہ مانا جاتا ہے اس کے دو بیٹے اجت سنگھ اور جوہر سنگھ مارے گئے۔ شاہی فوج راجپوتوں کی امداد کو آگئی اور گرو گوبند کو اندپور سے اور پھر ممبئی وارے سے نکال دیا اور اس کے دونوں بیٹوں کو گرفتار کر لیا۔ یہ دونوں بیٹے سر ہند بھیج دیئے گئے اور وہاں شاہنشاہ اورنگ زیب کے حکم سے زندہ دفن کر دیئے گئے۔ گرو گوبند سنگھ تلج کے جنوبی

۱۷ میرے ایک دوست سردار عطر سنگھ نے جو وارہ تلج کے سرداروں میں ہیں۔ اور بہادر کے جاگیردار ہیں ساکھیوں کے ایک نہایت دلچسپ مجھوتے کا ترجمہ شاخ کیا ہے۔ ان میں گرو تیج بہادر سنگھ اور ان کے بیٹے گرو گوبند سنگھ کے دیس بہ دیس آوارہ پھرنے اور جو واقعات ان کو پیش آئے ان کا ذکر ہے۔

جنگلوں میں بھاگتا پھرا اور بہت سی مشکلات کے بعد پٹیلے کے علاقے میں تلونڈی مقام پر مقیم ہوا۔ اس نے لوگوں کو ہدایت کی کہ جس طرح ہندو بنارس کو مقدس مقام مانتے ہیں اسی طرح سکھ اس مقام کو تصور کریں۔ یہ جائے قیام و مدے کے نام سے موسوم کی گئی کیونکہ لفظ دم کے معنی سانس لینے کے ہیں اور یہ مقام گویا گرو کے ٹھہر کر سانس لینے کا تھا۔ یہ سکھوں کا بہت بڑا مرکز ہے۔ گرکھی کے سب سے بہتر مصنف یہیں ملتے ہیں۔ ایک دوسرا مقام بھٹنڈا بھی جو اس ریاست کے علاقے میں ہے گرو کا دمدہ مانا جاتا ہے۔ یہاں اس نے ایک بھوت کو نکالا جو تمام شہر کو برباد کر رہا تھا۔ اور کچھ عرصے تک وہ اس قرب و جوار میں مقیم رہا اور اس افغان میں اس کی شہرت و اثر میں یوٹافیاؤں آتی ہوئی گئی۔

ساکھیوں میں اس کے اس جگہ کے قیام کے متعلق بہت دلچسپ واقعات مذکور ہیں۔ اور مذہبی مبانیوں کی آمیزش سے قطع نظر کر کے یہ ایک صحیح موقع سکھوں کے اس گرو کا تصور کئے جاسکتے ہیں جس کا شاہانہ دربار تھا جو اپنی فیاضی اور سخاوت سے لوگوں کو گرویدہ کر کے اپنا مرید بنا لیتا تھا اور مذہبی پیشوائی کے دعوے کے لئے معجزات کی بھی کمی نہ تھی۔ ساکھیاں گرو کی حیرت انگیز قوت کے خوارق عادات کے بیان سے بھری پڑی ہیں۔ یہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی دعا سے جو والدین اولاد سے محروم تھے وہ صاحب اولاد ہو گئے۔ اس نے بھوت پریت اتارے۔ دیہات سے بیماریاں دفع کیں۔ کھاری پانی کو میٹھا کر دیا۔ دغا و فریب کی سزا میں ہمالک موروثی بیماری پیدا کر دی اور سوکھے درخت پھولے پھلے۔ ایک موقع پر ہندو و مسلمان چور جو اس کے گھوڑے چرانے آئے تھے اندھے ہو گئے اور دوسرے موقع پر جعبندی کا اہلکار جو اس کے ایک معتقد کی پیداوار پر تینویں لگان کر نیکے لئے آیا تھا بالکل حساب کتاب بھول گیا اور اس نے گرو کی طاقت کو مان کے سکھ مذہب قبول کیا۔

گو بند سنگھ کی شان دشوکت بغیر جبر و تعدی کے نہ نبھ سکتی تھی اور گرو کی مسند یا نایب شاہی تحصیلداروں کے جانشین بن گئے تھے۔ یہ لوگ اس درجہ لالچی و دست دراز ہو گئے تھے اور ان کی وجہ سے اس قدر بددلی اور مزاحمت پیدا ہو گئی کہ گرو گو بند کو بالآخر انھیں بالکل برخاست کرنا پڑا۔ اس کے بعد وہ اپنے وطن انڈپور

میں واپس آگیا۔ راستے میں اس کا گزر سرہند سے ہوا اس کے متقدمین بادشاہ فہمائش اس مقام کو اس کے دونوں بیٹوں کے ظالمانہ طریقے پر قتل کئے جانے کے انتقام میں تباہ و برباد کرنے سے بے مشکل باز رہ سکے اس نے اس گانوں کو سراپ دی اور اپنے متقدمین کو ہدایت کی کہ جب کبھی وہ گنگا کی تیرتھ اور انسان کے لئے یہاں سے ہو کر جائیں یا وہاں سے واپس آتے ہوئے اس راستے سے گزریں تو اس گانوں کے مکانوں میں سے دو اینٹیں لے کر سلیج یا جننا میں پھینک دیں ورنہ ان کا گنگا انسان اکارت جائیگا۔ اب تک جو سکھ پیادہ پاتیرتھ کو جاتے ہیں اس حکم کی پابندی کیا کرتے ہیں لیکن ریل کے سفر نے پیادہ پاجاتریوں کی تعداد میں بہت کچھ کمی کر دی ہے۔ میرا گزر اکثر سرہند کے کھنڈروں اور وہاں کے خس و خاشاک کے انباروں میں ہوا ہے جس میں اب اصلی سرہند مدفون پڑا ہوا ہے اور ان کو دیکھ کر مجھے بھی اکثر اس بات کا خیال آیا ہے کہ درحقیقت یہ مقام لعنت زدہ ہے؟

اس کے کچھ عرصے بعد بعض وجوہ سے جن کا انکشاف نہیں ہوا اور اب تک مبہم ہیں۔ اور یقیناً اس کے طرز زندگی اور تعلیم کے خلاف تھے اس نے بہادر شاہ کی ملازمت کر لی یا یہ صورت ہوئی کہ مسلمان بادشاہ کو اس نے اپنا ایک سکھ دستہ سواروں کا سپرد کر دیا اور خود اس کی سرکردگی اس لئے اختیار کی کہ اس کے عام طور پر باغیانہ روش کے بارے میں شک و شبہ دور ہو جائے اور دار و گیر سے اسے کچھ عرصہ تک بجات ملے بہر حال وہ اپنے پیروؤں کے ہمراہ وکن گیا جہاں اسے ایک افغان کے رشتہ داروں نے قتل کر ڈالا جس کو اس نے ایک موقع پر غصے میں آکر قتل کیا تھا۔ سنہ ۱۷۷۸ء میں وہ (۳۸) سال کا ہو کر مقام ناندیڑ میں فوت ہوا جو دریائے گوداوری کے کنارے پر واقع ہے۔ اس مقام کو سکھ انجیل نگہ یعنی جاسے روانگی کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور یہاں اس کی یادگار میں ایک مندر قائم ہے جہاں بہت سے سکھ سال بسال جاترا کے لئے آتے ہیں۔ گردگو بند کی تعلیم کے سمجھنے کے لئے نانک کے اصول عقائد کا مختصر بیان ضروری ہے۔ سب سے پہلے یہ امر ذہن نشین رہنا چاہئے کہ گو سکھ لوگ ادی گرنیٹھ کی تعظیم بطور الہامی کتاب کے اسی طرح کرتے ہیں جس طرح عیسائی اور مسلمان اپنے اپنے کتب مقدسہ کی لیکن نانک اور اس کے جانشینوں کی

تحریروں میں جنہیں گروارجن نے یک جا جمع کیا ہے کوئی جدید اور نادرات ایسی نہیں ہے جس سے وہ اس سے زیادہ عظمت کی مستحق قرار دی جاسکیں۔ جو پنجابی ہندوؤں نے بھگت کبیر ایسے بزرگ اشخاص کی تعلیم کی تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ خود نانک نے اپنے تحریرات میں ان سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔ ادی گرتھ کے مندرجہ عقائد ہندوؤں کی تصوفانہ قدیم اور خالص تعلیم سے بہت کم اختلاف رکھتے ہیں۔ نانک خود صوفی مشرب تھا۔ اور اپنی زندگی کا بڑا حصہ اس نے سنیا س میں بسر کیا۔ گرو گوبند کی طرح اس کے خیالات سیاسی نہ تھے بلکہ درستی اخلاق پر مبنی تھے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندو جو اوہام اور باطل پرستی میں ڈوبے ہوئے ہیں اس سے ان کو نکالا جائے اور ان کو نیک عقائد اور عمدہ اخلاق کی تعلیم دی جائے اس پر لفظ مصلح کا پورا پورا اور صحیح طور پر اطلاق ہوتا ہے اور سکھ مذہب جس کی اس نے تلقین کی تھی باوجود اس کے کہ ادی گرتھ کے اخلاق و مبالغے سے بھرا ہے ایک ایسا مذہب ہے جو عملی و تمدنی لحاظ سے اعلیٰ نمونہ تصور کیا جاسکتا ہے اور جو مذہب دنیا کے دوسرے فلسفیانہ مذاہب کے زمرے میں بلند پایہ ہے۔

نانک کے خصائل و تعلیم میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو محققین کو بودھ مذہب کے بڑے مصلح کی زندگی و تعلیم کو یاد دلاتی ہیں جو عامہ خلائق کی بہبودی میں منہمک تھا اور جس کے عقائد عقائد نے نسل انسانی کے ایک پوتھا ئی حصے پر وسیع اثر کیا ہے۔

گرو نانک کے عقائد کا اصل اصول وحدانیت کی تعلیم ہے یعنی یہ کہ خداوند تعالیٰ وحدہ لا شریک لہ ہے جیسا کہ اس دور میں بیان کیا گیا ہے۔

تری ذات بے عیب ہے اے خدا نہیں مثل تیرے کوئی دوسرا

اس بارے میں ہندو مسلمانوں کے اختلاف کا بھی اعتراف کیا گیا ہے چنانچہ یہ تحریر ہے کہ طریقہ دوہیں (یعنی ہندو مذہب و اسلام، لیکن خدا صرف ایک ہے۔ خدا کو خواہ کسی نام سے پکارو۔ خواہ اسے برہم کہو ہری۔ رام خواہ گوبند وہ ہر صورت میں سمجھ سے بالاتر۔ ان دیکھا۔ لم یلد اور قدیم ہے اور صرف اسی کا وجود حقیقی ہے وہ تمام چیزوں کا مبداء اور علت العلل ہے اور انسان اور دوسرے موجودات عالم کا وجود اسی سے ہے اور اسی سے تمام چیزیں کلکائیں ہیں۔ جس طرح ڈارون نے مثلاً ارتقاء اجناس کی تعلیم دی ہے اسی طرح نانک نے بھی اپنی تعلیم میں یہ نہیں کہا کہ قادر مطلق نے نیست سے ہست کیا بلکہ خود اپنی ذات سے

تقدیر و صورت کو اختیار کیا۔ یہ تعلیم ہمہ اوست کی ہے جو گرتھ میں الوہیت کی فیض الشان تعلیم کے دوش بدوش مذکور ہے اور کہیں ایک اصول پر اور کہیں دوسرے اصول پر زیادہ زور دیا گیا ہے لیکن مجموعی حالت میں گرتھ کی تعلیم یہ ہے کہ ذی حیات اور غیر ذی حیات تمام موجودات عالم کا ظہور اُسی کی ذات سے ہے وہ خود موجود ہے اور سو اُس کے کوئی شے حقیقی یا موجود بالذات نہیں۔ قادر مطلق کے بغیر یہ عالم ایک سایہ سرب یا مغالطہ نظر ہے و گرتھ کے صفحہ ۶۶ پر یہ تحریر ہے کہ :-

۱۔ اس ایک ذات کا جلوہ ہر طرف دہر شے میں نمایاں ہے جہاں کہیں نظر ڈالو وہ ہی وہ نظر آتا ہے۔ وہ ایک کثرت میں پھیلا ہوا اور سب میں سایا ہوا ہے۔ جدھر میں دیکھتا ہوں وہی نظر آتا ہے مایا کے دلفریب سرب نے دنیا کو لبھا رکھا ہے۔ بہت کم ایسے لوگ ہیں جو حقیقت آشنا ہوں سب گو بند ہے اور سب گو بند ہے۔ گو بند کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ جس طرح ایک ڈوری میں سات ہزار دانے پروئے ہوئے ہوں اسی طرح خدا طول و عرض میں ہر طرف ہے و

۲۔ پانی کی موج۔ کف اور جباب پانی سے جدا نہیں ہوتے۔

یہ دنیا برہم کی بازیگاہ ہے وہی بازیگر ہے۔ وہ اور نہیں جو تلو گرتھ میں الوہیت کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ ہستی عظیم اپنی مخلوق سے بالکل جدا ہے اُس نے خلق کیا ہے اُسی مخلوق کا ظہور ہے۔ مایا یا فریب کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا وہ مایا سے بے لوث اور قائم ہے اس طرح جیسے کنول کا پھول اپنے کٹ سے جدا ہوتا ہے جہاں وہ موجود ہے گرتھ کے اکثر حصص میں شرک کی تردید و کندیب کی گئی ہے جب کہ وہ بت پرستی کی شکل اختیار کرے۔ لیکن نمک نے اپنی تعلیم میں براہِ شرک کی مخالفت نہیں کی ہے اور ویدوں کے لاکھوں عام معبودوں کے ماننے کی اجازت دی ہے جو اس کے خیال میں اس ہستی عظیم سے بدرجہا کمتر ہیں جس سے مثل اور دوسری اشیاء کے ان کا وجود عالم ہستی میں آیا و

۱۔ یہ تعلیم مذہب اسلام کے بالکل خلاف ہے، خداوند تعالیٰ عالم کی علتِ ادی نہیں ہے جو کہ اس تعلیم کا منہج، بلکہ وہ مادے کا خالق ہے خدا سے تعالیٰ کا ارادہ علتِ فاعلی ہے۔

۲۔ معاذ اللہ خدا کی ذات پاک کھیل کود سے بیزار ہے۔

نانک نے یہ تعلیم دی کہ انسان کی بڑی جدوجہد یہ ہونی چاہئے کہ وہ تناسخ سے کسی نہ کسی طرح نجات حاصل کر لے جس سے ہندو و سکھ کو کیساں اندیشہ ہے پڑ

ہندوؤں کا مسئلہ یہ ہے کہ تمام دنیاوی افعال کے ساتھ خواہ اچھے ہوں یا برے جزا و سزا لگی ہوئی ہے۔ پارسا اشخاص بہشت میں داخل ہوتے اور اپنی پارسائی کے لحاظ سے ایک مدت تک مقیم رہتے ہیں۔ اس کے بعد وہ نیک شخص پھر انسانی صورت کی بہترین حالت میں دوبارہ جنم لیتے ہیں اور یہ سلسلہ تناسخ جاری رہتا ہے اور ان کے افعال کے لحاظ سے ان کا آئندہ جنم ہوا کرتا ہے۔ اگر اس شخص کی زندگی بدکاری یا دنیا داری میں گزری ہے تو وہ دوزخ میں رکھا جاتا اور وہاں ایک مدت تک سزا بھگتنے کے بعد جانور کی شکل میں جنم لیتا ہے۔ جو شخص زیادہ اخلاقی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے وہ ادنیٰ درجے کے جانوروں کی صورت میں پیدا ہوتا ہے اور بے انتہا جنم لینے کے بعد وہ پھر آدمی ہو جاتا ہے اور اس قابل بنادیا جاتا ہے کہ نیک افعال سے اپنے پرانے جنموں کے گناہ کو دھو ڈالے۔ گرنجھ کی تعلیم کے لحاظ سے بھی انسان اپنے افعال کے انجام دینے میں کچھ زیادہ محتار نہیں ہے کیونکہ اس کی قسمت کا پہلے ہی سے تصفیہ ہو جاتا ہے یہاں تک کہ یہ فیصلہ اس کی پیشانی پر لکھ دیا جاتا ہے بہر حال یہ بالکل یقین اور صریح ہے کہ گرنجھ نے انسان کے افعال کے بارے میں خود مختاری سے بالکل انکار کیا ہے۔ اور اس کے علاوہ خواہ انسانی روح کا رجحان کتنا ہی نیکی کی طرف کیوں نہ ہو۔ لیکن پھر بھی مایا کی درست برد سے نہیں بچتی اور یہ ہمیشہ اس کو ٹھیک راستے سے بھٹکاتی رہتی ہے۔ نیکی۔ جہل اور شہوت وہ تین صفات ہیں جن میں سے ایک نہ ایک ہر انسان کی روح پر غالب رہتی ہے۔ اور انھیں صفات کے غلبے پر انسان کی موجودہ زندگی اور آخرت کی بھلائی کا انحصار ہے۔ اس نئے مذہب کے استحکام اور لوگوں کے اس کی جانب رجوع ہونے کا سب سے قوی سبب یہی تھا کہ وہ تناسخ سے رہائی دلانے کا وعدہ کرتا تھا جس کا خوف ہمیشہ عوام کے دلوں میں لگا رہتا تھا۔ جس طرح بہشت و دوزخ کی کنجیاں بطرس اعظم کے تفویض تصور کی جاتی تھیں اور اس اعتقادی قبضے کی وجہ سے رومی کلیسا نے لوگوں کے قلوب تسخیر کر کے اس قدر اقتدار حاصل کر لیا تھا اسی طرح گرو کی مدد سے تناسخ سے رہائی پا جانے کے دعوے نے

لے تناسخ کا عقیدہ بھی مذہب اسلام کے خلاف ہے۔

سکھ مذہب کو مقبولیت عطا کی۔ فیروزپور کے جنگلوں میں جہاں گوبند سنگھ نے شاہی فوج سے مقابلہ کر کے شکست کھائی اس نے اپنے تمام متقدمین کو جو لڑائی میں مقتول ہوئے یہی کشتی دینے کا وعدہ کیا۔ اس رہائی کی یادگار میں ایک بڑا قصبہ آباد اور ایک تالاب تعمیر کیا گیا جو اب تک کیتھرس کے نام سے مشہور اور بڑی زیارت گاہ تصور کیا جاتا ہے۔

اس عام مقدر سے نجات پانے اور ذات الہی سے وصال ہو جانے کے لئے ہری کے بزرگ نام کے جاپ کی ضرورت تھی اور اس کی اجازت عرف ان لوگوں کو دی جاتی تھی جو اس مذہب میں صحیح و جائز طریقے سے داخل ہوئے تھے جنہیں خود گرو نے جیلہ بنا کر صحیح طور پر اس بزرگ نام کے جینے کی تعلیم دی تھی۔ لیکن گرو کا اس طرح تلقین کرنا مسئلہ قضا و قدر کے لحاظ سے صرف ان ہی مخصوص جیلوں تک محدود تھا جن کی قسمت میں قسام ازل نے اس قسم کی رہائی لکھ دی تھی۔ اس مسئلہ تقدیر پر بحث نہیں کی گئی تھی جبکی بظاہر یہ وجہ تھی کہ جب لوگ عام طور پر یہ سمجھنے لگیں گے کہ گرو کو اپنے پیروں کی قسمت کے بدلنے میں کوئی اقتدار حاصل نہیں ہے تو اس کی غلطی میں فرق آئیگا عام طور پر یہ تعلیم دی گئی تھی کہ مذہبی پابندی اور گرو کی تعلیم پر صبر و استقلال کے ساتھ عمل کرنے سے دل نکو کاری کی طرف رجوع ہوگا اور اس وقت ایسا موقع نصیب ہوگا کہ انسان کا نوشتہ تقدیر جو اس کے ارادے سے کہیں بالاتر ہے بدل سکے۔ اگر اس عقیدے میں تناقض تھا تو وہ جبر و اختیار کے مسئلے کے لحاظ سے تھا جس سے ان اٹل احکام قضا و قدر سے بچنے کے متعلق انسانی خواہش کا انہار ہوتا تھا جو تمام عالم پر محیط اور نسل انسان پر حاوی ہے۔

گرنہ کی سب سے اہم تعلیم یہ ہے کہ گرو کی وقت و اطاعت اور رشیوں کی غلطی اور پریش کی جائے۔ پاک و صاف رہنے خیرات دینے اور گوشت خواری سے پرہیز کرنے کی بھی ہدایت کی گئی ہے۔ اخلاقی امور کے متعلق بدگوئی، بدکاری، غصہ، طمع، خود غرضی اور بد اعتقاد کی خاص طور پر ممانعت کی گئی ہے۔ نانک نے یہ بھی تعلیم دی ہے کہ متاثرہ شخص جو خاندان کا سردار اور کاروبار دنیا میں مصروف ہو قابل عزت سمجھا جائے اور اس نے خاص کر اس بات کی تردید کی تھی کہ رہبانیت کی زندگی اختیار کرنے سے کوئی خاص خوبی اور غلطی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کے نزدیک ہر ایک سچا مذہب

صرف رسوم کی ظہری پابندی اور مذہبی طریق اختیار کرنے تک محدود نہیں بلکہ اس کا زیادہ تر انحصار ہمارے قلب کی حالت پر ہے اور روحانی معاملات پر معمولی کاروبار دنیوی میں مصروف رکھ کر بھی انسان غور و خوض کر سکتا ہے اس کے لئے بادیہ پیمائی یا خانقاہوں میں عزلت گزینی ضرور نہیں۔ یہ سچ ہے کہ سکھوں کے اکثر تارک الدنیا فرقے جیسے اداسی واکلی نے تعداد کثیر میں ایک زمانے کے بعد نامک کی اس تعلیم سے انحراف کیا۔ لیکن یہ لوگ کم و بیش لا مذہب مانے جاتے ہیں اور عموماً سکھ مذہب جس کی نامک و گوبند سنگھ نے تعلیم دی دنیا دار لوگوں کے لئے بہت ہی موزوں ہے۔

گواہی گرتھ برہمنوں کے سخت خلاف اور ان کے دعووں کا منکر و مخالف ہے لیکن نامک نے براہ ذات کی قید مٹائے جانے کی تعلیم نہیں دی لیکن پھر بھی اس کی تعلیم کا بچان جمہوریت کی طرف تھا اور اس نے بلا امتیاز ذات ہر قسم کے لوگوں کو اپنا چیدہ بنایا۔ نامک کی تعلیم اس کے جانشینوں کی تعلیم سے ملتی جلتی تھی اور گرد گوبند کے زمانے تک اس میں کوئی اہم تغیر مذہبی و تمدنی حیثیت سے واقع نہیں ہوا۔ گرد گوبند کی تعلیم اور اس کے اصولوں نے سکھوں میں ایک دور جدید کی بنیاد ڈال دی اور وہی نامک کی تعلیم سے بڑھ کر انھیں ایک فوجی جماعت بنادینے کی محرک ہوئی اور اس کے اثر سے وہ آخر درحقیقت ایک فوجی گروہ بن گئے۔

گرد گوبند سنگھ کا رجحان اگرچہ ہمہ اوست کی لطیف تعلیم کے مقابلے میں شرک و بت پرستی کی جانب تھا لیکن اند پور کے سدھیوں نے جب اسے نئی پوٹھی مرتب کرنے کا طعنہ دیا تو اس نے اپنے بزرگ پیشرو کی تعلیم پر کسی قسم کا حملہ کرنا مناسب سمجھا اور نہ اس بات کی خواہش کی۔ اس کی بڑی خواہش صرف یہ تھی کہ سکھوں کا ایک جتھا قائم کر کے انھیں ہندوؤں سے بالکل علیحدہ کر دے تاکہ مسلمانوں کے مقابلے کے لئے انھیں وہ زیادہ آسانی سے آمادہ کر سکے۔ اس ضمن میں اس نے پہلے یہ کام کیا کہ اپنے فرقے میں ذات کے تفرقے کو مٹایا جس پر برہمن مذہب کا دار و مدار ہے اسی کے باعث سے اس مذہب کے پجاری قدرتی طور پر اس سے برا فروخت ہو گئے اور دوسرے اعلیٰ ذاتوں والے بھی اس کو مشتبه نظروں سے دیکھنے لگے۔ کیونکہ اس طرح ان لوگوں کو جنھیں وہ نظر حقارت سے دیکھتے تھے سکھ مذہب میں داخل کرنے سے

ان کے دیرینہ حقوق کی تحقیر اور ان کے تلف ہونے کا خوف تھا۔ نانک کا یہ عمل اپنی ذات کے ہندوؤں کی تبدیل مذہب کے لئے سدراہ تھا لیکن گردگو بند کی طرح اس نے اس امر کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔

گو بند سنگھ کی دوسری ہدایتیں جو اس نے اپنے پیر وڈوں کو ہندوؤں کی عام جماعت سے جدا کرنے کی غرض سے کی تھیں ان سے زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں یہ ہدایتیں زیادہ تر طرز لباس۔ آداب اکل و شرب و پرستش کے بارے میں تھیں سکھوں کو نیلے لباس پہننے کی ہدایت کی گئی تھی لیکن عرصے سے یہ طریقہ متروک ہو گیا ہے صرف اکالی سکھ اس کے پابند ہیں۔ انھیں تموار باندھنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ اور اس کے علاوہ اور پانچ اشیاء تھیں جن کے نام پنجابی زبان میں حرف ک سے شروع ہوتے ہیں۔ کیس یعنی ڈاٹھی دسر کے بال۔ کھنڈا یا خنجر۔ کنگھیا شانہ۔ کڑا یا ہنسی چوڑی۔ گچھ یا گھٹنوں تک پا جامہ۔ پانچویں چیز کے استعمال کی ہدایت اس لئے کی گئی تھی کہ ان کا ہندوؤں سے امتیاز ہو جائے۔ کیونکہ ہندو عموماً دھوتی باندھتے ہیں۔ اسکے علاوہ سکھوں کو تمباکو نوشی کی بھی ممانعت کی گئی جس کا عام طور پر ہندوؤں میں رواج ہے۔ اس کی پابندی میں یقیناً وقت ہوئی ہوگی مگر اس کا نتیجہ بھی مفید نہ ہوا۔ کیونکہ سکھ اس کے معاوضے میں افیون دھننگ کے بہ کثرت عادی ہو گئے جو تمباکو سے بہرہ جاز زیادہ مضر ہے وسط ایشیا کے جو شیلے مسلمانوں میں بھی اس قسم کے ممانعت کا یہی نتیجہ ہوا۔

دختر کشی کی ممانعت کی گئی اور اس کے مرتکب کو لھون قرار دیا گیا۔ گو بند سنگھ کے زمانے میں اور سرکار انگریزی کے پنجاب کو الحاق کرنے کے وقت تک یہ رسم پنجاب میں شدت سے جاری تھی خصوصاً اپنی ذاتوں میں جیسے راجپوت جنھیں اپنی لڑکیوں کی شادی کرنے میں بڑی وقت بیش آتی تھی۔ مثلاً جمو کے مہاراجہ گلاب سنگھ کے راجپوت خاندان کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ اس خاندان میں علی العموم یہ رسم جاری تھی اور ۱۸۵۱ء تک اس خاندان میں کبھی کسی لڑکی کی شادی نہیں ہوئی۔ اس سال مہاراجہ کی پوتی کی شادی جسوال کے قدیم خاندان کے لڑکے کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے رچائی گئی۔ باوجود گو بند کی ممانعت کے سکھوں میں

میت تک یہ رسم جاری رہی اور اب بھی پنجاب کے بعض مقامات میں سکھ پوجاریوں کے بعض خاندان ہیں جن میں اس رسم کے رواج کا شبہ باقی ہے لیکن عام طور پر انگریزی حکومت کے اثر نے اس بزدلانہ قبیح رسم کا پنجاب میں خاتمہ کر دیا ہے۔ لڑکی یا بہن کو دان لے کر بیاہنے کی بھی ممانعت کی گئی تھی لیکن اس حکم سے بھی اکثر پہلو تہی کی جاتی ہے ۛ

سکھوں کو اس ذبیحے کا گوشت کھانے کی ممانعت تھی جو عام طریقے پر کیا جائے اور یہ ہدایت تھی کہ جس جانور کا گوشت وہ کھائیں اسے تلوار کی ایک ہی ضرب سے ہلاک کیا جائے جس کو عموماً جھٹکا کہتے ہیں۔ گرنچہ میں گائے کے گوشت کی کوئی خاص ممانعت نہیں ہے لیکن قدیم روایات کا گہرا اثر دلوں پر بیٹھا ہوا تھا اور سکھوں کے نزدیک بھی گائے کی وہی حرمت برقرار رہی جو ہندوؤں کے نزدیک ہے۔ سرحدی لوٹ مار میں جب کبھی مغلوب مسلمان سکھوں کے قدموں پر گر پڑتے اور گھانس کا چھوٹا سا پولا اٹھا کر اپنے دانتوں میں دبالیٹے اور پکارتے کہ "میں تمہاری گائے ہوں۔" مسلمان خاص طور پر ملعون تصور کئے جاتے تھے اور سکھوں کو ٹوپی پہننے سے باز رکھنے کا مقصد یہ تھا کہ لباس میں بھی ان کا مسلمانوں سے امتیاز ہو۔ ان دشمنان ایمان کے ساتھ لڑائی کرنے کی ہدایت تھی اور انھیں کسی طرح امان دینے کی اجازت نہ تھی۔ ان کے علاوہ ان سکھوں کو جو مذہب کے پابند نہ ہوں اور جین اور جوگیوں کو بھی ملعون قرار دیا گیا تھا ۛ

دوسرے جزوی امور کے جواز و عدم جواز کے متعلق بھی ہدایتیں کی گئی۔۔۔
 تھیں۔ ایک سب سے اہم فرض گرنچہ کا روز پڑھنا قرار دیا گیا تھا جس کی تعمیل ناممکن تھی کیونکہ سکھ عموماً ناخواندہ ہوتے تھے اور مجبوراً انھیں اسی امر پر قناعت کرنا پڑا کہ وہ گائے یا بھے اس کو پوجاریوں یا گرنتھوں سے پڑھوا کر سن لیا کریں یا اس کا کوئی حصہ جسے انھوں نے حفظ یا ذکر لیا ہو دھرا لیا کریں ۛ

گو بند سنگھ کی تعلیمات کے شایع ہونے کے بعد سکھوں کے عقائد میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا لیکن جیسا کہ کسی دوسری جگہ بیان ہو چکا ہے ان ہدایتوں کی تعمیل میں سہل انگاری ہونے لگی یہاں تک کہ ابھی چند سال قبل مصلحوں کی ایک جماعت

پیدا ہو گئی جس کی بناء راولپنڈی کے ایک اداہی فقیر نے قائم کی۔ اس کا جائزین ضلع لدھیانہ کا ایک بختار رام سنگھ نامی بڑا صاحب اثر شخص ہو گیا اور بہت سے فدائی اس کے ساتھ ہو گئے جو کوکا کے نام سے موسوم کئے گئے۔ یہ لوگ خاص لباس باہمی شناخت کے لئے خاص الفاظ معین کرنے اور سیاسی جماعت قائم کرنے کی وجہ سے دوسروں سے تمیز کئے جاتے تھے۔

اصل تحریک کا رنگ شروع میں مذہبی تھا جس کا مقصود یہ تھا کہ سکھوں کے طرز عمل کی اصلاح کر کے انہیں گوبند سنگھ کے زمانے کے مطابق بنایا جائے۔ جس قدر اس جماعت میں ترقی ہوتی گئی ان لوگوں کے حوصلے بھی بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ خالصہ حکومت کی تجدید اور انگریزی کے نیست و نابود کرنے کی تلقین شروع کر دی گئی اُس وقت میں حکومت پنجاب کا چیف سکرٹری تھا اور ان دنوں میں کوکوں کی کارروائیوں سے بہت کچھ تشویش و پریشانی پیدا ہو رہی تھی۔ باوجود ان کے باغیانہ اور مفویانہ تعلیم کے ان کے ساتھ کوئی مزاحمت اس وقت تک نہیں کی گئی جب تک انہوں نے علانیہ بغاوت پھیلانا کر لدھیانہ کے قریب مسلمانوں کے قصبے مالیر کو ٹلہ پر حملہ نہیں کیا۔ اس واقعے کے بعد بغاوت نہایت سختی کے ساتھ فرو کی گئی اور سرسری تحقیقات کے بعد وہ انخاص کو توپ دم کیا گیا۔ اس کے علاوہ کوکا سرغنوں کو پنجاب کے مختلف اضلاع میں ایک ہی شب میں گرفتار کر لیا گیا اور وہ جلاوطن کئے گئے۔ ان میں سے کچھ رنگون بھیجے گئے کچھ عدن اور جو زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے وہ پنجاب کے قید خانوں میں قید کئے گئے۔ قسمت انبالہ کے مقامی عہدہ داروں کا باغیوں کو توپ دم کرنا حکومت پنجاب اور حکومت عالیہ نے ناپسند کیا اور ہنگامہ فرو کرنے کے لئے اس عمل کو سنگین تصور کیا لیکن ان کی کارروائی نیک نیتی پر محمول کی گئی اور عموماً اس مصلحت کی تائید کی گئی جس کی بناء پر اس ہنگامے کو اس قدر جلد اور یقینی طور پر فرو کیا گیا بہر حال یہ امر یقینی ہے کہ جو کارروائی اس وقت کی گئی اس سے اس زبردست اور ہیبت ناک شورش کی پورے طور پر بیخ کنی ہو گئی جو حکومت برطانیہ کے خلاف برپا کی گئی تھی اور گو کوکا جماعت نیست و نابود نہیں ہوئی لیکن یہ فرقہ ذلیل و خوار تصور کیا جانے لگا اور اس کی دست برد و عیا نشانہ روش کی وجہ سے سکھوں کی جماعت

عام طور پر اسے حقیر ذلیل سمجھنے لگی ہو

عام معاملات میں سکھ ہندو شاستر کے پیر و تھے لیکن بعض اہم معاملات میں خصوصاً شادی بیاہ کے بارے میں وہ خود اپنے علیحدہ مراسم کے پابند تھے اور اس لحاظ سے وراثت و تر کے معاملات پر ان مراسم کا اثر پڑتا تھا یہ مسئلہ قاعدہ تھا کہ اگر وراثت و تر کے بیوہ کو تمام جائیداد کے میں مل جاتی تھی لیکن اس نامہذب زمانے میں جب کہ تنازعات کا تقصیف صرف تلوار سے ہو کر رہا تھا اور مستورات میں اتنی طاقت نہ تھی کہ مردوں کی کمائی پر جو انھوں نے اپنے قوت بازو یا زبردستی حاصل کی تھی قبضہ برقرار رکھ سکیں اس رسم سے بڑی مشکلیں پیش آتی تھیں۔ سکھ مستورات میں بھی اپنی جنس کی بہت سی خوبیاں موجود تھیں اور اکثر اوقات دانشمندی اور خوش انتظامی میں مردوں کے ہم پایہ ثابت ہوئی تھیں پٹیلہ کی رانی اوس کور۔ انبلہ کی رانی دیا کور اور مائی سوڈا کور جو مدت تک زبردست کنھیا خاندان کے جتھے کی سرغنہ رہیں اس کی مثالیں ہیں۔ لیکن عموماً جب کوئی جائیداد کسی سکھ بیوہ کے ہاتھ لگ جاتی تھی تو اندیشہ یہ رہتا تھا کہ وہ اس کے آشنا کے دست تصرف میں نہ آجائے اور وہ اس کو اس وقت تک اپنے ذاتی نفع کے لئے استعمال نہ کرے جب تک کہ کوئی دوسرا شخص جس کا حق مرجع ہو اس پر قبضہ نہ کر لے۔ اس خرابی کے دفعیے کے لئے متونی کے بھائی کے ساتھ اس کی بیوہ کے ازدواج کی رسم کو رواج دیا گیا جو اگلے زمانے میں یہودیوں میں جاری تھا۔ بیوہ کو اختیار تھا کہ متونی کے بھائیوں میں سے جسے چاہے پسند کر لے لیکن بڑا بھائی اگر چاہے تو اس کا حق مرجع سمجھا جاتا تھا۔ اس قسم کے ازدواج کو چادر ڈالنا نہ کر یا د کری ہوئی کہتے تھے جس سے مراد یہ تھی کہ عورت کا پہلا بیاہ ہو چکا ہے۔ چونکہ اس رسم کی غرض یہ تھی کہ خاندان میں جائیداد کی توریث قائم رہے اس وجہ سے اس قسم کے ازدواج سے جو اولاد پیدا ہوئی تھی وہ ویسی ہی جلیز بھی جاتی تھی جیسے باقاعدہ شادی بیاہ کی اولاد۔ اور توریث کے بارے میں ایسی اولاد کے حقوق بھی اس قسم کی اولاد کے مساوی تھے لیکن ان کا رتبہ و وقعت شادی کی اولاد کی سی نہ تھی۔ چادر ڈالنے کے رسم کی سہولت نے خصوصاً لڑائی کے موقع پر جب کہ شادی کے دیر طلب مراسم انجام دینا دشوار تھے یا دلہن کے ذات ورتبے کے لحاظ سے موزوں نہ تھے جو اکثر نوٹائی یا لڑائی میں گرفتار کی ہوئی کوئی لڑکی ہو سکتی تھی

بھائی کی بیوہ کے علاوہ دوسروں کے ساتھ بھی اس طریقہ عمل کو عام طور پر رائج کر دیا لیکن چونکہ ایسے موقعے پر خاندان میں تو ریت برقرار رکھنا مقصود نہ تھا اس لئے چادر ڈالی ہوئی بیوی اور اس کی اولاد کی کوئی وقعت نہ تھی اور اس کی حیثیت آشنا سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ چونکہ اس طریقے میں کوئی رسم ادا نہ کیا جاتا تھا اس لئے اس کی حالت ہمیشہ مشتبہ رہتی تھی اور بسا اوقات نوڈیوں نے اپنے آقاؤں کی وفات کے بعد اس قسم کی چادر ڈالنے کے ازدواج کی بنا پر جائداد کا دعویٰ کیا اور لوگوں نے ان کی تائید میں جھوٹی گواہیاں دیں کیونکہ مشرق میں ایسی گواہی دستیاب کرنا کچھ دشوار نہیں ہے ہمارا جہلیلیہ کی ماں کی بھی یہی حالت تھی۔ وہ صرف محل کی سازش سے لاہور کے تخت کا وارث قرار دیا گیا۔ حالانکہ اس کی ماں ایک معمولی نوڈی تھی ۶

عام طور پر یہ امر تسلیم کر لیا گیا تھا کہ بیوہ جب اس کے متوفی شوہر کے بھائی اسکے خواستگار نہ ہوں تو عقد ثانی کرنے کی مجاز ہے اور ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ عورتوں نے تیسرا بیاہ تک کیا ہے جس کو تھر لوا کہتے ہیں ۶

میٹوں کی وراثت کے بارے میں دو رسمیں جاری تھیں۔ ایک تو چادر بند جو انجھا سکھوں میں زیادہ مروج تھا دوسرے بھائی بند جس کا رواج مالو اسکھوں میں تھا پہلے کے رو سے جائداد ماؤں پر مساوی حصوں میں تقسیم ہوتی تھی اور دوسرے کے لحاظ سے میٹوں پر مساوی حقوق میں۔ مثلاً ایک شخص نے دو بیوائیں چھوڑیں جن میں سے ایک کے ایک لڑکا اور دوسرے کے تین لڑکے ہیں۔ چادر بند کی رو سے پہلی بیوہ کے اکیلے لڑکے کو نصف حصہ ملیگا اور اس کے باقی تین سو تیلے بھائیوں کو فی بھائی چھٹا حصہ۔ بھائی بند کے لحاظ سے ہر لڑکے کو چوتھا حصہ ملیگا ۶

شادی بیاہ کی ان بے قاعدہ رسوم کی پابندی اونچی ذات والوں یعنی برہمن وکھتریوں میں باوجود مذہب سکھ قبول کرنے کے نہیں ہے۔ یہ لوگ قدیم ہندو رسموں کے پابند ہیں لیکن باوجود اس کے قدیم مذہب کی پابند جماعت انھیں ذات باہری تصور کرتی ہے اور اپنی لڑکی نہیں دیتے الا اس صورت میں کہ ایک بڑی رستم بطور معاوضہ

۱۔ یہ فقرہ کیا دل آزار ہے۔

دی جائے۔ ایسی صورتوں میں لڑکی والے اپنی لڑکی کو یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ مر گئی ہے۔ لڑکیاں اور ان کی اولاد ہر صورت میں مستحقِ توریث نہیں سمجھی جاتیں کیونکہ اگر ایسی توریث ایسے لوگوں میں جائز رکھی جائے جن میں لڑکی سنِ بلوغ پر پہنچنے کے ساتھ ہی بیاہ دی جاتی ہے تو جائیداد کے اصل خاندان سے منتقل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

ادبچی ذات کے سکھ سرداروں میں ستمی یا بیوہ کا اپنے خاوند کی نفش کے ساتھ جلنے کا طریقہ جاری تھا ان لوگوں میں عورت کو عقد ثانی کا حق حاصل نہ تھا۔ بسا اوقات ستمی کی ملازمہ اور گھڑ بٹھی آشنا کو بھی اس رسم کی پابندی کرنی پڑتی تھی۔ مثلاً جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کا انتقال ہوا تو اس کی ایک رانی مہتاب دیوی اور اس کے زمانے کی تین عورتیں بن کا مرتبہ رانی کا تھا ان کے ساتھ جلائی گئیں۔ مہتاب دیوی راجپوت اور راجہ سنسار چند کٹوچھ کی ناجائز اولاد تھی۔ رنجیت سنگھ کے فرزند مہاراجہ کھرک سنگھ کی نفش کے ساتھ اس کی چادر ڈالی ہوئی بیوی ایسور کو راجپوت عورت تھی جلائی گئی۔ وہ ستمی ہونے پر رضامند نہ تھی اور کہا جاتا ہے کہ دیواں دھیان سنگھ نے اسے زبردستی جلوادیا۔ رنجیت سنگھ کے پوتے نونہال سنگھ کی دو بیویاں اس کے ساتھ ستمی ہوئیں۔ ان تمام واقعات میں سے دو آخری ستمیاں پنجاب کے مشہور واقعات میں سے ہیں جن سے اس رسم کے حسن و قبح کا اظہار ہوتا ہے بالفاظِ دیگر یا نہایت بے رحمی و سفاکی سے مذہب کے پردے میں ان کی قربانی کی گئی یا انھوں نے اپنی خوشی اور رضامندی سے جل کر جان دی اور اپنی وفاداری و جاں نثاری کا ثبوت دے کر نیکنامی کا ثمنہ حاصل کیا۔

یہ بلا واقعہ ۱۷۷۷ء میں ہوا۔ عیاش و شرابی جو اہر سنگھ کو جو رانی بندیاں کا بھائی اور ریاست کا دیوان تھا اہل فوج نے غصے میں آکر اس شبیہ میں مار ڈالا کہ وہ خالصہ مذہب کے ساتھ بدعہدی کرتا ہے اور ان کا یہ شبہ درحقیقت ایک حد تک درست بھی تھا۔

سلطہ غالبیہ رانی اپنی مرضی سے ستمی ہوئی کیونکہ مفرد راجپوت عورتیں اپنے خاوندوں کے ساتھ جلنے کے قبیح و ناگوار رسم کی پابندی کرنے کو اپنی شرافت کا ثمنہ تصور کرتی تھیں۔ جب سمیت سنگھ مہاراجہ شہر کے دادا کا بھائی جو بڑا خوبصورت تھا لاہور میں مارا گیا تو اس کی اس بیوی اور اس کے محل کی تین سو آشتائیں ستمی ہو گئیں۔ بعض لاہوریوں نے ایک سو پچاس رگم نگر میں جہاں اس کا سر لایا گیا تھا اور باقی جموں یا اپنے اپنے مکانات میں۔

لاہور کے قلعے کے باہر میدان میں اس کی نش جلائی گئی۔ قرار پایا کہ اس کی چار بیوائیں بھی اس کے ساتھ جلائی جائیں۔ ان بد نصیب عورتوں نے اپنی جان بچانے کے لئے بہت التجائیں کیں لیکن ایک بھی قبول نہ ہوئی۔ چٹا کا منظر بڑا دلخراش تھا۔ اہل فوج غصے میں آپے سے باہر ہو رہے تھے اور ان میں ضبط و پابندی باقی نہ رہی تھی۔ ان لوگوں نے ان عورتوں کے بدن کے تمام زیور زبردستی اتار لئے اور ناکوں میں سے نتھیں کھینچ لیں۔ ہندوؤں میں سستی کی بڑی حرمت مانی جاتی ہے اور اس کے آخری الفاظ پشین گوئی تصور کئے جاتے ہیں۔ راجہ دینا ناتھ جو رانی کے قائم مقام کی حیثیت سے وہاں موجود تھا اور دوسرے اشخاص ان عورتوں کے قدموں پر گر کر دعا کے طالب ہوئے۔ سٹیوں نے دینا ناتھ اور ہمارا راجہ کو دعا اور خالصہ فوج کو بد دعا دی۔ جب پنجاب کی آئندہ قسمت کے بارے میں ان سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے یہ پشین گوئی کی کہ سال بھر کے اندر ملک کی آزادی چھن جائے گی۔ خالصہ برباد اور فوج والوں کی عورتیں بیوہ ہو جائیں گی۔ اس کے بعد وہ زبردستی آگ کے شعلوں میں جھونک دی گئیں لیکن ان کی پشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور ان کی بد دعا ایسی پوری ہوئی کہ پہلے کبھی کوئی بد دعا نہ پوری ہوئی ہوگی؟

ستی کا دوسرا واقعہ اٹاری کے سردار شام سنگھ کی بیوہ کا تھا۔ شخص سکھوں میں بڑا شریف و نیک نہاد تھا۔ وہ سہراؤں کی جنگ میں کام آیا اس نے انگریزوں کے ساتھ جنگ کرنے پر اظہار ناپسندیدگی کیا تھا اور اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس جنگ کا نتیجہ کیا ہوگا لیکن باوجود اس کے وہ خالصہ کی جانب سے لڑنے پر آمادہ ہو گیا اور سہراؤں کی جنگ سے قبل کی رات کو اس نے گرنہتھ پر ہاتھ رکھ کر اس امر کا عہد کیا کہ وہ میدان جنگ سے مغلوب ہو کر نہ پلٹے گا۔ صبح کے وقت وہ سفید لباس اور سفید مادیان پر سوار ہو کر لشکر کے روبرو آیا اور اپنے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ اگر وہ خالصہ کے سپوت ہیں تو اپنی جان دیدیں لیکن شکست گوارا نہ کریں۔ جنگ کے ابتدائی حصے میں تو وہ ہر جگہ پہنچ کر سکھوں کی ہمت افزائی کرتا رہا لیکن جب اس نے دیکھا کہ ہزیمت پیشینی ہے تو وہ خود تلوار لے کر پچاسویں رجمنٹ پر گھوڑے کو ہمیز کر کے جا بڑا اور فوج والوں کو اپنا ساتھ دینے کے لئے پکارتا رہا۔ تقریباً پچاس آدمیوں نے اس کا ساتھ دیا لیکن وہ پسپا ہو کر تلج میں ڈھکیل دیئے گئے اور شام سنگھ کے

سات گویاں لگیں جس سے وہ ہلاک ہو کر سواری سے گر پڑا۔ لڑائی کے بعد اس کے خادموں نے اس کی نعش ڈھونڈنے کی اجازت طلب کی۔ بڑھے سردار کا اپنے سفید لباس و سفید لمبی داڑھی کی وجہ سے باسانی پتہ چل گیا اور جس جگہ کشتوں کے پشتے لگے ہوئے تھے وہیں اس کی بھی لاش ملی۔ اس کے نوکروں نے اس کی نعش کو ایک چوگھڑے پر رکھا اور اس کے ساتھ دریا میں پیر کر پڑا کر گئے لیکن لاش تیسرے دن سے پہلے اس کے وطن اٹاری پہنچ سکی۔ اس کی بیوہ نے جسے اس کے ارادے اور غم بالجنم کا علم تھا کہ وہ شکست کھانکر زندہ نہ رہیگا اُس لمبوس کے ساتھ جو سردار نے شادی کے دن پہنا تھا اس کے آنے سے قبل جل کر جان دیدی۔ سنی کا یہ واقعہ پنجاب میں سب سے آخری تھا۔ جس مقام پر یہ واقعہ ہوا وہاں ایک ستون بطور یادگار بنایا گیا جو اب تک اٹاری کی چار دیواری کے باہر ایستادہ ہے۔ اولاد کا ناجائز ہونا اس کے تواریث کی مانع سمجھی جاتی تھی لیکن اس نامہذب زمانے میں جب کہ زبردست کی مرضی ہی قانون سمجھی جاتی تھی ناجائز اولاد کو اکثر وہ رتبہ حاصل ہو جاتا تھا جس کے وہ از روئے پیدائش مستحق نہ تھے۔ اس کے علاوہ کسی عورت پر چادر ڈالنے سے اس کی حیثیت جائز بیاہی ہوئی کی سی ہو جاتی تھی اس وجہ سے جائز و ناجائز اولاد میں امتیاز کرنا دشوار تھا قطع نظر اس کے ناجائز اولاد اور جائز و ناجائز آشناؤں ہی میں بھی مزاج تھے۔ نوٹڈی کی اولاد اس اولاد کے مادی تصور نہ کی جاتی تھی جو کسی شریف عورت کے بطن سے پیدا ہوتی جو سردار کے گھر میں اس کی دامن کے ساتھ آتی ہو

ایک جیدیوں کے تواریث کے بارے میں بھی طرز عمل مختلف تھا لیکن عام قاعدے کے مطابق اس کی مخالفت کی جاتی تھی جیسا کہ کریوا طریقہ ازدواج سے ثابت ہوتا ہے جس کے رد سے وہی شخص تواریث کا مستحق ہوتا جو اپنے بھائی کی بیوہ سے شادی کرتا ورنہ اور کسی طرح اسے کوئی حق حاصل نہ ہوتا تھا۔ ہمارا جہ رنجیت سنگھ نے یکجہیوں کو کسی قسم کا حق دینے سے قطعی انکار کیا اور لوگوں کے اولاد ذکر نہ ہونے سے فوت ہونے پر بذات خود ان کی جائیدادوں پر قبضہ کر لیا گو بعد میں بھاری رقم جرمانہ یا نذرانہ دینے پر جائیدادیں کسی عزیز کے نام واگذاشت کر دی گئیں۔ نتیجہ اس پار کے زیر حفاقت ریاستوں میں انگریزوں کا طرز عمل بھی یہی رہا مگر اس کے وجہ ان اسباب سے زیادہ قوی تھے کیونکہ مالو اسکھ مانجھا سکھوں کے مقابلے میں دلی کی حکومت کے زیادہ تر فرمانبردار تھے کیونکہ مانجھا سکھ

فتح اور اپنے مقبوضات پر بلا دخلت غیرے قابض تھے اور رنجیت سنگھ محض قسزاق سرداروں میں زیادہ کامیاب بصدق اندھوں میں کانارا جہ تھا اس قاعدے کے لحاظ سے سرکار انگریزی بعض بڑی بڑی ریاستوں پر قابض ہو گئی مثلاً پوریا۔ انبالہ۔ تھانیس۔ دیال گڑھ۔ رو دور۔ مصطفیٰ آباد۔ فیروز پور اور کھیل سنگھ ۱۸۶۱ء میں سرکار انگریزی نے اپنی پالیسی میں تبدیلی کی اس طرح جائدادوں کو ضبط کر کے قبضہ کرنے سے دست بردار ہونے اور بڑے بڑے سرداروں کو بتنی کرنے کا حق عطا کیا۔ یہ مسئلہ امر ہے کہ عموماً یہ طرز عمل دانشمندانہ تھا اور اس سے سرکار انگریزی کا اقتدار دیسی ریاستوں میں قوی و مستحکم ہو گیا لیکن بحث طلب امر یہ ہے کہ کیا اس قسم کے سلوک میں افراط اور عمومیت نہ تھی اور آیا یہ امر زیادہ مناسب نہ تھا کہ تبعیت کی اجازت ایک معینہ میعاد تک سرکاری اعلیٰ خدمات کے صلے میں خاص رعایت کے طور پر دی جاتی اور ہر منفرد صورت میں حالات پیش آمدہ کے لحاظ سے اس کے جاری رکھنے یا نہ رکھنے کا تصفیہ کیا جاتا بہ حالت موجودہ لارڈ کیننگ کے بلا امتیاز عام طور پر تبعیت کی اجازت دیدینے سے سرکار کو گویا خداوند مجزی بنا دیا جس کی بخشش و عطا تھی وغیرہ حق ہر ایک کے لئے یکساں ہے۔ اس طور پر وفاداری و جان نثاری کی بہترین جزا اور بغاوت و سرکشی کی سزا دینے کا موقع ہاتھ سے نکل گیا ۶

باب چہارم

رنجیت سنگھ کی سپدائش کے وقت پنجاب کی حالت

گرو گو بند سنگھ نے اپنے متقیدین کو یہ تلقین کی تھی کہ وہ آخری گرو ہے۔ اس کے مرنے پر جس کام کی انجام دہی اسے مقصود تھی اس کی تکمیل ہو چکی تھی یعنی سکھوں کی مفرد دروہلیوں و جنگجو جماعت قائم اور ان لوگوں کے دلوں میں سلمان حملہ آور فاتحین اور آقاؤں کی جانب سے نفرت جاگزیں ہو چکی تھی۔ گرد کے دماغ نے خالصہ جماعت اس طرح پیدا کر دی تھی جس طرح کہا جاتا ہے کہ جو بیڑ دیوتا کے سر سے منہرہ پیدا ہوئی تھی۔ یہ لوگ اب فتح حاصل کرنے کے لئے مسلح اور عام ساز و سامان سے آراستہ تھے۔ صرف کچھ ہستی۔ فوجی جذبے اور ہم مذہبی نے ان برگزیدگان شمشیر کو قوی بنا رکھا تھا۔ مگر دشمن کے ہزاروں کے مقابلے میں ان کی تعداد محدود تھی اپنے مخالفین کے مقابلے میں جنھیں ہندوستان کے تمام وسائل پر اقتدار حاصل تھا یہ یہ لوگ کم مایہ اور کم حیثیت تھے۔ سوائے مذہب۔ بہادری و تلووار کے ان کے پاس کچھ نہ تھا اور سلطنت مغلیہ سے صرف اسی برتنے پر وہ مصروف پیکار ہوئے۔ اس سلطنت کے محاصل شاہ اور ننگ زیب کے زمانے میں آٹھ کروڑ یا اس رقم کے دگنے تھے جو اب باوجود کثرت آبادی سرکار انگریزی کو حاصل ہوئے ہیں۔ سکھوں کو خوش قسمت سے شاہ اور ننگ زیب کے منصب نے بہت کچھ مدد دی کیونکہ اس کی وجہ سے ہر ایک ہندو باجگزار ریاست میں لوگ اس کے دشمن ہو گئے تھے اور بالآخر اسی سبب سے اس کی سلطنت عظیم پاش پاش ہو گئی۔ خود مختاری جس کی بنا محض شخصی اوصاف پر ہو کبھی محفوظ نہیں رہ سکتی۔ ظلم کا خاں دار شجرہ دشمنی۔ بے غرضی اور کرم گستری کا ثمر نہیں لاتا۔ قسمت کے کھیل میں عام طور پر جہل۔ ظلم اور تعصب کا پانسہ ایک خود مختار بادشاہی خاندان کے نام ہی بٹکا کر جاتا ہے۔ اگر اکبر اعظم کے مثل فرماواؤں کا سلسلہ جاری رہ سکتا جو غالباً تمام اوصاف کو مد نظر رکھے ہوئے مشہور مطلق العنان حکمرانوں میں باعتبار فہم و فراست ذی شان اور فرد کامل تصور کیا جاسکتا ہے تو سلطنت مغلیہ آج بھی اسی طرح سرسبز ہوتی اور انگریز تجارت

تحت طاؤسی کے روبرو بجز واکسار شاہی نوازشوں کے اسی طرح طالب نظر آتے جیسے کہ شروع زمانہ سلطنت میں تھے۔ لیکن اورنگ زیب کا ناقابل برداشت تعصب جس کی ذات میں مذہبی امور سے قطع نظر کر کے بہت سی خوبیاں تھیں اور اس کی زندگی عیوب سے پاک تھی اپنے پیشروؤں اور جانشینوں کے اسراف سے زیادہ سلطنت کی بربادی کا باعث ہوا۔ اس کی ایذا رسانی سے سکھوں میں اپنے مذہب کے ساتھ وابستگی پیدا ہو گئی اور اذیت و موت کی تحویف نے ایک شخص کو بھی اسلام قبول کرنے پر آمادہ نہ کیا۔ ہمیشہ سے یہ ہوتا چلا آیا ہے کہ شہد اکا خون کشت مذہب کی سیرانی کا باعث ہوا کرتا ہے۔ اورنگ زیب اس کی بیخ کنی پر تو قادر نہ ہو سکا۔ مگر اس کے مذہبی تعصب اور نارواداری کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ سکھ مذہب کے پیروں میں حرارت اور جوش مذہبی پیدا ہو گیا اور سکھوں کو اسلام سے ایسی سخت نفرت ہو گئی کہ جس کی چنگاریاں اب تک ان کے سینوں میں پوشیدہ ہیں اور اگر انگریزی حکومت آج اپنا درست راست اٹھالے تو پھر وہ شعلے آج ہی شتمل ہو جائیں۔ دہلی نے اس حرارت کی چاشنی چکھی ہے اور ممالک مغربی و شمالی کے افغانوں نے بھی۔ اور اگر وسط ایشیا کے غازی ہندوستان کی تاخت و تاراج پر دیوانہ وار اٹھ کھڑے ہوں تو پھر وہی آگ بھڑک اٹھے گی۔

گرو گوبند سنگھ کی وفات سے لے کر نجیت سنگھ کی پیدائش تک سکھوں کی تاریخ کا ذکر نہایت ہی مختصر الفاظ میں کیا جاسکتا ہے (خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ میں نے سکھوں کی ابتدا و خصوصائص و مذہب کے بارے میں اس سے قبل ذکر کر دیا ہے) تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کس قسم کے لوگوں پر مہاراجہ کی حکومت تھی اور ان کے عقائد کیا تھے جس کا منصبی حیثیت سے وہ قائم مقام تھا۔ مانجھا سکھوں کے متعلق شائع سے لے کر ۱۸۴۷ء تک ۷۲ سال کا تاریخی مواد کم یا ب و ناقابل اعتماد ہے۔ لیکن جنوبی علاقے کے سکھوں کے متعلق ہمارے معلومات زیادہ ہیں اس زمانے کے اسلامی واقعات کا بیان مختلف دو لچپ ہے۔ یہ نادر شاہ اور احمد شاہ کے حملوں اور سلطنت مغلیہ کے بتدریج انحطاط کے واقعات سے پر ہیں۔ جب کہ اس سلطنت کے صوبہ داروں نے بادشاہ کے اقتدار سے سبکدوش ہو کر اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔

گوبند سنگھ کا فوجی جانشین بند اتھا جس نے اورنگ زیب کے تین جانشینوں کے

زمانے میں بڑی مستعدی و تھوڑی بہت فوجی قابلیت کا اظہار کیا۔ شاہی فوج کو ایک سے زیادہ موقعوں پر شکست دی، باری دو آب کے قطع ملک کو تاخت و تاراج کیا اور بالآخر سالہ ۶ میں اپنے ہزاروں ساتھیوں کے ساتھ گرفتار و قید ہو کے دہلی بھیج دیا گیا جہاں وہ مختلف انداز سانیوں کے بعد قتل کیا گیا قتل کرنے سے پیشتر اسے اس امر پر مجبور کیا گیا کہ اپنے رٹ کے کو اپنے ہاتھ سے ہلاک کرے۔ اس قتل شکست کے بعد سکھوں کے حالات کا نادر شاہ کے حملے کے زمانے تک کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ نادر شاہ کے دہلی پر بہ آسانی فتح پانے اور شہر کی لوٹ مار سے سلطنت منلیہ اس درجہ کمزور ہو گئی کہ سکھوں کی ہمت پھر بندھی اور وہ لڑائی پر پھر آمادہ ہو گئے۔ ان کی نظر میں تمام مسلمان خواہ وہ ایرانی ہو یا افغان یا منل یکساں قابل تنفر تھے اور انھوں نے بڑی سرعت کے ساتھ یا تو نادر شاہ کی منتشر فوج پر حملہ کیا یا احمد شاہ ابدالی کے لشکر کے ساز و سامان کو لوٹ لیا جو نادر شاہ کے قتل کے بعد افغان نشان کا مالک بن گیا تھا اور سکندریہ میں پنجاب پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس بادشاہ نے سکھوں کی دلجوئی کی اور وہ اس بات میں خوش تھا کہ انھیں اپنا طرفدار بنا کر پہلے دہلی کی سلطنت کے خلاف اور پھر مہنوں کے مقابلے میں جنھیں اس نے بعد میں شکست دی ان سے کام لیتا۔ لیکن سکھ اگرچہ منلوں سے متنفر تھے لیکن افغانوں سے بھی انھیں کوئی اُنس نہ تھا اور وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ دہلی میں ایک ایسی سلطنت قائم کر کے جو اپنی ماقبل سلطنت سے زیادہ طاقتور ہو جو اپنی گردنوں میں اس سے زیادہ مضبوط طوق غلامی ڈال لیں۔ سکھوں کی شہسواروں کی سادہ مزاجی اور سرعتِ نقل و حرکت نے انھیں ہیبت دشمن بنا رکھا تھا اور گوانھوں نے مسلمانوں کی مرتب اور بار ساز و سامان آراستہ فوجوں سے سخت اور متواتر شکستیں کھائیں لیکن ان شکستوں سے انکی ہمت نہ ٹوٹی اور وہ صرف اس لیے منتشر ہوتے تھے کہ دوسرے بار اس سے زیادہ قوت کے ساتھ مقابلے پر آئیں۔ احمد شاہ نے جو اولو العزم سردار تھا گواں میں اجتماع و انتظام کی قابلیت بہت کم تھی اور جس کے مفتوحہ مقامات بہت جلد اس کے قبضے سے نکل جاتے تھے کئی سال تک مسلسل ہندوستان پر حملے کیے۔ بعض اوقات وہ جنوب کے جانب دہلی تک بڑھتا چلا گیا اور دوسرے موقعوں پر لاہور یا ستلج سے آگے نہ بڑھا۔ ہر موقع پر اسے سکھوں سے مقابلہ کرنا پڑا جن کا اعتماد و قوت رو بہ ترقی تھا اور جن میں ہمیشہ جتھ یا مثل بندی ہوتی رہتی تھی جس کے ذریعے سے فزاق سرداروں کا ایک گروہ جمہوریت و مساوات کے اصول پر کسی ایک

طاقتور پیشوا کے جھنڈے کے ساتھ شریک اور اس کے عام احکام کا پابند ہو کر لڑنے کا عہد کیا کرتا تھا۔ اس اجتماع نے انھیں اور مہیب بنا دیا۔ مختلف پیشواؤں نے اپنی بستیوں کی جگہوں پر قلعے تعمیر کر لئے اور بدریچ پنجاب کے تمام میدان پر غالب آ گئے اور اس طور پر مسلمان صوبہ داروں کو ان کے قلعہ ہائے سرہند - دینا نگر اور لاہور میں محصور کر دیا۔ لاہور پر انھوں نے دو مرتبہ قبضہ کر لیا اور غرضے تک اس پر قابض رہے۔ انھوں نے امرتسر میں منبرک مقامات کی از سر نو تعمیر کی اور نیرجل تالاب کو پھر بھر دیا۔ جب افغان بادشاہ پہاڑوں سے اتر کر سال بہ سال ہندوستان پر حملہ آور ہوتا تو سکھ اس کے روبرو سے ہٹ جاتے اور اس کے واپس ہوتے ہی غارتگری جاری کر دیتے اور جسے وہ عارضی طور پر اس کے آنے کی وجہ سے چھوڑ بیٹھے تھے پھر حاصل کرتے سکھوں کی تاریخ میں ۱۶۹۲ء ایسا سال ہے جس میں سکھوں کی تاریخ میں ایک ایک تفریق عظیم واقع ہوا۔ اس کے مختصر واقعات اس وجہ سے قابل ذکر ہیں کہ خلاصہ فوج پہلی مرتبہ ایک باقاعدہ فوج کے مقابلے پر آئی۔ اگرچہ انھیں شکست فاش نصیب ہوئی لیکن انھیں اپنے آپ پر اس قدر بھروسہ ہو گیا کہ دوسرے ہی سال انھوں نے سرہند کا صوبہ فتح کر کے اینرو سے ستلج ریاستوں کی مستحکم بنا قائم کر لی پڑ

۱۶۹۱ء میں احمد شاہ نے زین خاں کو سرہند کا صوبہ دار مقرر کیا تھا۔ لیکن جوں ہی افغانوں نے وطن کی طرف مراجعت کی سکھوں نے تعداد کثیر میں مجتمع ہو کر زین خاں کو قلعے میں محصور کر دیا۔ اور اگر مالیر کوٹلے کے مسلمان پٹھان مدد پر نہ آ جاتے تو یقیناً سکھ قلعہ پر قبضہ کر کے فوج کو تباہ کر ڈالتے احمد شاہ جب دوسرے سال ہندوستان آیا تو اس نے سکھوں کے سرہند پر حملہ کرنے کی گستاخی کی پاداش میں انھیں سزا دینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ سکھ بڑنالے کے قریب جمع ہوئے تھے جو اس زمانے میں پٹیالے کا ایک بڑا شہر تھا اور اینرو سے ستلج کے سرداروں کے علاوہ مانجھا سکھوں کے اکثر پیشوا احمد شاہ کے آگے بڑھتے ہی ستلج عبور کر کے ان کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ افغانوں کی نقل و حرکت ایسی عجلت کے ساتھ تھی کہ وہ سکھوں پر دفعۃً پہنچ گئے اور ان کو محصور کر کے لڑنے پر مجبور کیا۔ سکھوں کو شکست نصیب ہوئی ان کے بیس ہزار آدمی مارے گئے اور بہت سے گزخار ہوئے جن میں پٹیالے کا سردار آلا سنگھ بھی تھا جس کی رہائی کے لئے پانچ لاکھ معاوضہ طلب کیا گیا۔ بمشکل تمام یہ رقم ادا کی گئی۔ احمد شاہ نے جو بڑا ذی فہم تھا یہ سمجھ کر کہ سکھوں پر

اپنی طاقت کا بین ثبوت دینے کے بعد ان کی تالیف قلوب کرنا بڑی دانشمندی ہے آلا سنگھ سے
بنفگیہ ہو کر اسے خلعت اور راجہ کا خطاب عطا کیا؛

اس غیر معمولی اعزاز سے دوسرے سکھ سرداروں کے دل میں آلا سنگھ سے کاوش
ورنجش پیدا ہو گئی اور انھوں نے یہ مشہور کیا کہ اس نے ان کے ساتھ دغا کی اور یہ خطاب
اسی دغا کے صلے میں اسے دیا گیا ہے اور سکھوں کے لئے یہ امر باعث توہین ہے کہ وہ ایک
مسلمان غیر ملکی اور دشمن کا دیا ہوا خطاب قبول کریں۔ یہ لوگ اپنی شکست کا انتقام اس سے
ضرور لیتے لیکن سردار جہا سنگھ اہلو والیہ جو اس زمانے میں آلا سنگھ سے زیادہ با اثر شخص تھا
اس کی طرف داری پر کمر بستہ ہو گیا۔ اس وقت تو بات رفع گذشت ہو گئی لیکن آلا سنگھ کے لئے
یہ لازم ہو گیا کہ وہ اپنے افعال سے یہ ثابت کر دے کہ وہ درانی بادشاہ کا محکوم نہیں ہے؛
احمد شاہ کے کابل واپس ہوتے ہی سکھوں کی ہمت پھر بڑھ گئی۔ تلج کے شمال و
جنوب کی ریاستیں پھر ایک بار باہمی تنازعات کو فراموش کر کے سرہند پر متفقہ کوشش سے
دھاوا کرنے پر آمادہ ہو گئیں آلا سنگھ بھی بڑے جوش و خروش سے ان کا شریک ہوا۔ سرہند
کے قرب و جوار میں سکھ مانجھا سے آکر شیرتدا میں جمع ہوئے اثناء راہ میں انھوں نے
لاہور کے جنوب میں قصور شہر و قلعے پر قبضہ کر لیا۔ مالوے کے سردار بھی آئے اور پوری
فوج جو تقریباً سب کی سب سوار تھے تئیس ہزار کی تعداد تک پہنچ گئی۔ زین خاں صوبہ دار نے
اس بھروسے پر کہ باقاعدہ فوج کا نظارہ سکھوں کے دلوں میں دیسی ہی دہشت پیدا کر دیگا
جیسا کہ اس سے قبل ظاہر ہو چکا تھا فوج کو قلعے سے باہر نکال دیا اور اپنی شہر کی بسکون وہ
مارا گیا اور فوج کو شکست فاش ہوئی۔ سکھوں نے فوراً شہر پر قبضہ کر لیا اور اپنے گرو کے
بچوں کے وہاں مارے جانے کے انتقام میں انھوں نے اسے لوٹ کر برباد کر دیا۔ سرہند
کا صوبہ فاتحین پر تقسیم کیا گیا۔ سرہند شہر اور اس کے مضافات راجہ آلا سنگھ کو دئے گئے۔
احمد شاہ جب دوسرے سال آیا تو اس نے سرہند واپس لینے یا وہاں کوئی صوبہ دار مقرر
کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ واقعات موجودہ کے لحاظ سے آلا سنگھ کو سارا ضلع سالانہ
خراج ادا کرنے پر دیدیا؛

اس طور پر سکھوں نے شکست و فتح دونوں حالتوں کے لحاظ سے ایسی حیثیت
پیدا کر لی جو اس سے قبل انھیں حاصل نہ تھی اور اگر خانگی تنازعات دفع کر کے وہ باہم

مشفق ہو جاتے جیسا کہ سرہند کی فتح کے موقع پر ہوا تھا تو وہ بھی شمالی ہند میں اسی قدر مہیب و ناقابل دفع ہو جاتے جیسے جنوب و مغرب میں مرتھتے تھے۔ لیکن سکھوں کی بہوریت پسندی نے جو لوگوں کے عام لبائع کے مطابق تھی ایسی تمام کوششوں کی مخالفت کی جس کی رو سے کوئی ایک شخص اس کا حاکم بن سکے اور مرکزی حکومت قائم ہو سکے یہاں تک کہ رنجیت سنگھ نے تمام مخالفتوں کا قلع و قمع کر کے رقیب و مخالف ہر دونوں کو ایک حالت میں لاکڑ طبع کر لیا؛

۱۲۔ سے لے کر ۱۸۔ رنجیت سنگھ کی پیدائش یا اس کے باپ مہان سنگھ کی وفات تک سکھوں کی تدریجی ترقی کے واقعات اور خود رنجیت سنگھ کے ۱۹۔ میں سکرچاکیا کے مثل پیشوائی جانشینی کے واقعات جو اہم و دلچسپ ہیں دوسری کتابوں میں دیکھنا چاہئے؛

(۱) یہاں صرف سکھوں کے عام جتو یا مثل بندی یا ریاستوں کے واقعات کی تصریح ضروری ہے اور یہ کہ کون اضلاع کس سردار کے قبضے میں تھے؛

عام طور پر سکھوں کے بارہ مثلیں مانی جاتی ہیں اور گویہ تعداد صحیح نہیں ہے اور انہیں بہت سی ایسی ریاستیں ہیں جو اس نہرست میں شامل کئے جانے کے قابل نہیں ہیں لیکن عام خیال کے مطابق میں نے اس کی پابندی کی۔ بہر حال میں نے ان کی ترتیب اس اہمیت کے لحاظ سے کی ہے جو ہمارا راج رنجیت سنگھ کی پیدائش کے وقت انھیں حاصل تھی؛

(۱) پھلکساں (۵) رام گڑھیسا (۹) سکرچاکیا

(۲) اہلووالیہ (۶) سنگھ پوریا (۱۰) دولی والہ

(۳) بھنگلی (۷) کرڈوڑا سنگھیا (۱۱) نک کاٹی

(۴) کنھیا (۸) نشانیا (۱۲) شہید

مذکورہ صدر میں سے نمبر ۲-۳-۴-۵-۹-۱۱- تلچ کے شمال کے قطعات

پر اور باقی ۶ اس کے جنوب کے قطعات پر قابض ہیں۔ پھلکیاں کی مثل ان سرداروں کے

(۱) اس بارے میں مغرب میری تصنیفات پنجاب کے سردار اور راجگان پنجاب میں اس زمانے کے واقعات کا بالتفصیل

بیان کیا گیا ہے جہاں میں تلچ کے شمال کے مختلف مشلوں کے پورے واقعات رام گڑھی۔ بھنگلی اور کنھیتوں کے زیر عنوان

مندرجہ ہیں اور اخیر میں پھلکیاں و اہلووالا مشلوں کے تاریخی حالات۔

جیتھے پر مشتمل ہے جن کے آبا و اجداد یکجہتی تھے اور آجکل ان کے جانشین ان کی اولاد میں سے ہمارا جہ پٹیا لہ۔ راجگان جیندہ۔ نابھہ و سردار ان بہادر۔ ملوڑ اور بعض ان سے کم رتبہ سردار ہیں۔ سکھوں کی ابتدائی تاریخ میں اسے بہت کچھ اہمیت حاصل تھی لیکن باوجود خاندانی تعلق کے یا آنکہ اسی کی یہ دولت یہ مثل شاذ و نادر باہم مل کر کام کرتے اور جو وقت اسے حاصل تھے ان سے بہرہ ور نہ ہوتی؟

اہلوالیہ خاندان کا بانی سادھو سنگھ ایک جاٹ کلال ذات کا تھا جو موضع اہلو میں آکر سکونت گزین ہوا اور اس پر اس کے خاندان کا نام پڑ گیا۔ لیکن اس اتحاد کا اصلی بانی سردار جاسنگھ تھا جو سادھو کی پانچویں پشت میں تھا۔ یہ شخص گرو گوبند کے انتقال کے دس سال بعد شکار میں پیدا ہوا۔ اس نے رفتہ رفتہ بہت اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ نہایت قابل و کامیاب فوجی پیشوا تھا۔ دوسرے سرداروں کے مقابلے میں اس نے سکھوں میں کچھ پیپا کرنے کے متعلق سب سے زیادہ کوشش کی اور ۱۷۳۷ء میں جب وہ فوت ہوا تو اس وقت سکھ سرداروں میں وہ سب سے زیادہ بااثر تھا اس کے مقبوضات زیادہ تر شیلج و بیاس کے مابین کے قطعات میں تھے۔

بھنگیوں کا نام ان کے مشہور و معروف سردار ہری سنگھ کے بھنگ نشے کے ولادہ ہونے سے پڑا۔ سردار ہری سنگھ نے اپنے بھائی جھنڈا سنگھ اور گنڈا سنگھ کو ساتھ لے کر امرتسر کے ضلع کو اپنا صدر مقام بنایا اور اس پاس کے ملک میں لوٹ مار مچائی۔ ملتان کو فتح کیا اور کئی سال تک وہ اس پر قابض رہا۔ ہمارا جہ رنجیت سنگھ نے اپنے ابتدائی زمانے میں ہی ان کی قوت بالکل توڑ دی جیسا کہ آگے چل کر ظاہر ہوگا۔

کنھیا بھی بھنگیوں کے طرح ملاقات ورتھے۔ ان کے مقبوضات مدت تک ان کے قبضے میں رہے جس کی وجہ یہ تھی کہ رنجیت سنگھ سے ان کا ازدواجی تعلق تھا۔ ان کے سردار جے سنگھ نے اپنی شیرخوار پوتی ہتھاب کو رنجیت سنگھ کو بیاہ دی تھی۔ اور رنجیت سنگھ خود اس وقت چھ سال کا تھا۔ ۱۷۴۹ء میں جب جے سنگھ مر گیا تو اس کی بہو سردا کو رنے جو ہتھاب کو ر کی ماں تھی اور بڑی قابل لیکن بدچلن تھی ریاست کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور اپنے داماد کے خلاف ۱۷۵۷ء تک مقابلے میں جمی رہی۔ کنھیوں کے مقبوضات امرتسر و گرداسپور کے اضلاع وسیع قطعات پر مشتمل تھے۔ اس خاندان کی

دوسری عورت رانی چند کو رہنے جس کی شادی کھڑک سنگھ سے ہوئی تھی جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کا اکلوتا بیٹا تھا سد اکور کی سی زندگی بسر کی۔ ان دو سازشی عورتوں کے واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سکھوں میں نانک و گوبند کی آزادانہ تعلیم کی بدولت عورتیں کس درجہ ذی اثر ہو کر آتی تھیں؟

رام گھڑھیہا مثل کنھیا مثل کے ساتھ امرتسر کے متبرک شہر اور اس کے گرد و نواح کے اضلاع پر تصرف تھی اپنے عروج کے زمانے میں وہ آٹھ ہزار فوج میدان جنگ میں لاسکتی تھی۔ سردار جٹا سنگھ جو اس کا نامور سپہ سالار تھا شہنشاہی میں اس کا پیشوا بنا۔ اس نے پہلے امرتسر کی قلعہ بندی کی۔ اس کے ارد گرد ٹٹی کے اونچے اونچے دھس بنائے گئے اور اس کا نام رام روتی یا خدائی قلعہ رکھا۔ ادینا بیگ نے اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد حملہ کر کے اسے برباد کر دیا۔ یہ شخص جالندھر و آب میں شاہ دہلی کی جانب سے صوبہ دار تھا۔ اس کے مرنے پر جٹا سنگھ نے قلعے کی از سر نو تعمیر کی اور اس مرتبہ اس کا نام رام گڈھ رکھا جس نام سے اس کی ریاست موسوم ہوئی؟

یہ شخص مشہور جنگجو امیر تھا۔ اس نے بڑی فوجیں سرکیں اور دہلی کی چار دیواری تک لوٹ مار کر تباہ بیچ گیا۔ ایک موقع پر یہ ناف شہر میں جا پہنچا اور مغلوں کی بستی میں سے ۴۴ توہیں اٹھالے گیا میرٹھ کے صوبہ دار نے اسے خراج ادا کیا؟

سنگھ پور یا کی ریاست ایک زمانے میں بڑی طاقتور تھی اور جٹا سنگھ اہلووالیہ۔ پٹیالے کے آلا سنگھ کے زمانے سے قبل اس کا بانی سردار کپور سنگھ سکھ امرا میں سب سے زیادہ با اثر شخص مانا جاتا تھا۔ یہ شخص نواب کے نام سے مشہور تھا۔ سکھوں کے مخصوص اسلامی خطاب اختیار کرنے کی یہ ایک نادر مثال ہے۔ اس نے امرتسر کے قریب موضع فیض اللہ پور کو فیض اللہ خاں سے چھین کر اس کا نام سنگھ پورہ رکھا اور اسی نام پر مثل کا نام پڑ گیا گو اسے اکثر فیض اللہ پورہ کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ سردار ۱۷۳۳ء میں فوت ہوا اور جٹا سنگھ اہلووالیہ بلحاظ اقتدار و اثر اس کا جانشین ہوا۔ گو ملک پر اس کا بھتیجا خوش حال سنگھ اور اس کی اولاد قابض رہی اس ریاست کے زیر تصرف لدھیانہ۔ نورپور۔ جالندھر اور ضلع انبالے کے شمالی مغربی قطعات تھے؟

سرور سنگھی جس کا نام سردار کٹوڑا سنگھ کے نام پر ہے دریائے جمنہ و مکند کے

مابین قطعات پر قابض تھے۔ کلیسا کا زبردست خاندان اس مثل کا اصلی رکن تھا اور اب تک ایندوے ستلج میں اس کی حکومت قائم ہے۔ اس کے علاوہ سردار بھگیل سنگھ کا خاندان بھی تھا لیکن اب وہ بالکل مٹ چکا ہے۔

نشانہ یا وہ لوگ خالصہ کے نشان یا جھنڈا اٹھاتے تھے کبھی زیادہ موثر نہ سمجھے گئے۔ سردار جے سنگھ نے جو اس ریاست کا سب سے بڑا شخص تھا ۶۳ء میں سرہند کی فتح کے بعد جائداد حاصل کی اس مثل والوں کا قبضہ انبالہ۔ لدیان۔ شاہ آباد۔ الملوہ اور دوسرے اضلاع میں تھا۔

سکرچاکی اپنے اصلی مقبوضات کی مقدار کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس لحاظ سے مشہور ہیں کہ ان کا آخری قائم مقام ہمارا جہ رنجیت سنگھ تھا۔ ان کے حالات ہمارا جہ کے حالات کے ضمن میں بیان کیے جائیں گے۔

دولی والی ریاست کا نام سردار تارا سنگھ کے موضع کے نام پر رکھا گیا جو اس کا اصل پیشوا اور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ جالندھر کے بالائی دواب اور انبالہ اور لدھیانہ کے شمالی حصوں اور فیروز پور کے بڑے حصوں پر قابض تھا۔ نکائی اس ملک میں سکونت کریں تھے جو نکا کے نام موسوم ہے اور لاہور و گجرات کے مابین ملتان کی سمت میں واقع تھا۔ ریاست کبھی طاقتور نہ تھی لیکن لڑائی کے موقع پر دو ہزار سوار۔ اونٹوں کی قطار اور چند توپیں میدان جنگ میں لاسکتی تھی۔ پنجاب کے اس حصے کے جاٹ اپنی بہادری میں مشہور ہیں اور سردار بہرا سنگ و رام سنگھ کی ماتحتی میں انھوں نے نولاکھ مالیت کی جاگیر گجرات و مشرق پور میں حاصل کر لی تھی۔

شہید مثل جوان ریاستوں میں سب سے آخر تھی فوجی جماعت سے زیادہ ایک مذہبی تھی کی حیثیت رکھتی تھی۔ اگرچہ اس زمانے میں پجاری بھی دوسرے دنیا دار لوگوں کی طرح لڑا کرتے تھے۔ خالصہ جماعت مذہبی جنگ آزمائوں کا ایک حقیقی اور اصلی گرو شہید مثل کا بانی سڈا سنگھ تھا جو تلونڈی کے مندر کا ہنسٹ یا پجاری تھا۔ جہاں گرو گوہند نے قیام کا وہ یاد مرہ بنایا تھا۔ جالندھر کے مسلمان صوبہ دار سے لڑتے ہوئے وہ مارا گیا اور بیان کیا جاتا ہے کہ باوجود سرکٹنے کے گھوڑے پر سے گرنے کے قبل کچھ دور تک سوار اور دشمنوں کو قتل کرتا ہوا بڑھا چلا گیا۔ اپنا بناء پر اسے شہید کے لقب سے

موسوم کیا گیا اور اس کے پیروں کا یہی نام پڑ گیا۔ ریاست بطور خود لڑنے کے بجائے دوسروں کے شریک حال ہو جاتی تھی۔ رانیا۔ کھتری اور جردولی کے قرب و جوار میں اس نے اٹاک حاصل کی۔ اور اس کے جانشین اب بھی وہاں کے مندر کے متولی ہوتے ہیں۔

یہ ہے مرقع سکھوں کی ان جنگجو ریاستوں کا جو اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی کے اوائل میں قائم تھیں لیکن ان کی ترکیب ہمیشہ تبدیل ہوتی رہی اور ان کے مقبوضات جلد جلد ایک دوسرے کے پاس منتقل ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ آپس میں اس سے زیادہ لڑتے تھے جیسے کہ اپنے عام دشمن مسلمانوں سے لڑا کرتے تھے۔ ان کی باہمی جنگ کا خاتمہ رنجیت سنگھ نے اس طور پر کر دیا کہ جو ریاستیں انگریزوں کے زیر حفاظت نہ تھیں انہیں بالکل نیست و نابود کر دیا۔ خود ریاستوں کے حدود کے اندر امر میں باہم لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں اور کبھی ایک کے اور کبھی دوسرے کی طرف سے اس کی ابتدا ہوتی تھی۔ اس کی وجہ سکھ مذہب کی ترکیب تھی جس کی رو سے کسی قسم کی متابعت یا محکومیت تسلیم نہیں کی جاسکتی تھی۔ ان کے مذہب کا اصول انھوں نے تھا اور سکھوں کو یہ غرہ تھا کہ وہ آزاد سپاہیوں کا ایک جتھا ہیں یہ زمانہ خالصہ کی کم عمری و امنگ کا زمانہ تھا اور کسی فرد واحد کو کوئی غیر معمولی قوت و طاقت حاصل نہ تھی۔ ایسی حالت میں آزادی کا خیال حقیقت سے بعید نہ تھا۔ لیکن جس قدر بڑے سرداروں کی قوت میں تدریج ترقی ہوتی گئی اسی قدر ان کے چھوٹے چھوٹے پڑوسی اس امر پر مجبور ہوتے گئے کہ دوسروں کی دست برد سے محفوظ رہیں یا خود ان ریاستوں میں ضم ہونے سے بچنے کے لئے کسی ایسے پیشوا کے زیر حفاظت ہوں جو ان کی حفاظت کر سکے اور اس کے معاوضے میں وہ میدان جنگ میں اس کی خدمت کریں۔

اس زمانے میں سکھ سردار اپنے تابعین سے بجز ایک گھوڑے اور ہندو کے اور کوئی مطالبہ نہیں کرتے تھے اور جو شخص ان کا تابع ہوتا وہ صرف ان کی حفاظت اور اس اجازت کا خواستگار نہ ہوتا کہ خدا اور گرو کے نام پر اس سردار کے جھنڈے تلے رہ کر لوٹ مار کرنے کا موقع اس کو دیا جائے۔ خواہ کی کوئی بحث ہی نہ تھی۔ تمام سکھ اصولاً مساوی تھے۔ ہر سکھ جو امر سنگھ جیٹھیہ کی طرح تیر کو درخت میں آ رہا چھید سکے یا سری سنگھ کو آ کر

خیر کو ایک ضرب تیغ میں ہلاک کر سکے اپنے آپ کو سردار کہلانے کا مستحق تھا اور ایک جماعت تابعین کی قائم کر لیتا تھا۔ ایک وقت وہ آیا کہ سکھوں نے بھی یہودیوں کی طرح اپنا بادشاہ مقرر کیا اور ایک حد تک مساوات کے خواب کو بھول گئے جو انھیں کسی زمانے میں بہت عزیز تھا۔

لیکن تلج کے شمال و جنوب کے تمام بڑے خاندانوں کی ابتدا ایک ہی سی ہے۔ جس طرح درحقیقت دنیا کی تمام طاقتور جماعتیں قائم ہوئی ہیں اسی طرح سکھوں کی جماعت کی بنیاد بھی قوت کے قانون۔ تلوار کی دھار اور قوت بازو پر تھی۔ ہر سکھ سردار کی بڑی خواہش یہ تھی کہ اپنی طاقت و کامیابی کی بنا پر تابعین کو اپنی جانب رجوع کرے۔ اگر ایسے تابعین لڑنا اور سواری جانتے تھے جن سے ہر سکھ آشنا تھا تو اس کی کوئی پروا نہیں کی جاتی تھی کہ وہ کون ہیں اور ان کی گزشتہ زندگی کے حالات کیا ہیں۔ اس زمانے میں ہر گانوں قلعہ بنا ہوا تھا جو اونچے ٹیلے پر بسا ہوتا تھا تاکہ گرد و اطراف کے میدان پر نظر پڑ سکے۔ گانوں میں داخل ہونے کے لئے صرف ایک راستہ ہوتا تھا اور گلیاں ایسی تنگ ہوتی تھیں کہ دو آدمی بمشکل پہلو بہ پہلو چل سکتے تھے۔ بڑوسی کا لفظ دشمن کا مترادف سمجھا جاتا تھا اور کاشتکار بل جوتے کے وقت بندوق اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ کوئی شخص اپنی زمین۔ گھوڑا یا بیوی اس وقت تک محفوظ نہ سمجھتا تھا جب تک کہ خود اس میں ان کی حفاظت کرنے کی طاقت نہ ہو کیونکہ گو سکھ پیشوا مسلمانوں کو لوٹ مار کرنے اور شاہی محافظوں کے گرفتار کرنے سے بہت خوش ہوتے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ وطن دوست ہونے سے زیادہ قسراتی تھے اور بلا کسی لحاظ یا رورعایت کے لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ لیکن ایک امر میں ان کی تعریف کی جاسکتی ہے اور یہی چیز جو ان کو وسط ہند کے پنڈاریوں اور آجکل کے ڈاکوؤں سے میسر کرتی ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ انسانوں کی طرح لڑتے اور لوٹ مار کرتے۔ تھے اور ایسے موقعوں پر یہ عفریت نہ بن جاتے تھے سکھوں کی تاریخوں میں بہت کم ایسے واقعات نظر آئینگے جن میں عورتوں کی آبروریزی اور مردوں کو اذیت پہنچائی گئی ہو جیسے ظلم و ستم کے واقعات سے جنوبی ہند کی تاریخ کے صفحات آلودہ ہیں۔

یہ سچ ہے کہ لڑائی میں بہت سی خوبصورت جاٹ لڑکیاں گرفتار کی گئیں لیکن وہ خود گرفتار کیئے جانے پر رضامند تھیں۔ انھیں چھپنے ہی سے یہ تعلیم دی گئی تھی کہ خاوند کے

اوصاف صرف یہ ہیں کہ وہ شجاع و طاقتور ہو۔ اور وہ خاموشی سے اپنے آپ کو بطور انعام اشیائے شخص کے حوالے کر دیتی تھیں جس نے میدان جنگ میں لڑ کر انھیں جیتا ہوا اور بعد میں ان کو اپنی جائز بیوی بنا لے گا اس نے ان کے بھائیوں کو قتل اور ان کے کانوں کو گنگ لگا دی ہو۔ لیکن اگرچہ سکھ بلاشبہ تراق تھے اور جس طرح اسکاٹ لینڈ کے سرحد پر سو سال پہلے ہوا کرتا تھا مویشیوں کی چوری ان کے ہاں ایک نہایت معزز پیشہ شمار ہوتا تھا لیکن بہر حال ان کا دینی جوش اور مسلمانوں سے متفرق جنھوں نے عرصے سے انھیں پامال کر رکھا تھا اور ان کے پیشوا، مذہب کو قتل اور ان کی قربان گاہوں کو مسمار کر دیا تھا۔ اس سے ان کو ایک خاص قسم کا وقار حاصل ہو گیا تھا اور ان کے اغراض و فوجی ہمت میں تقریباً قومی رنگ پایا جاتا تھا۔

سکھوں کی فوج دل خالصہ (خدائی فوج) یا بعض اوقات بدھادل (آزمودہ کار فوج) کے نام سے موسوم کی جاتی تھی اس میں زیادہ تعداد سواروں کی ہوتی تھی جو کٹیا وند کہلاتے تھے اور جو اپنی سواری کے گھوڑے خود ہتیا کرتے تھے اور مال غنیمت سے ان کو دو ہر حصہ ملتا تھا ہر سردار اپنے وسائل آمدنی کے لحاظ سے اپنے تابعین کے لئے جو بار گیر کہلاتے تھے گھوڑا اور ہتیار مہیا کیا کرتا تھا اور کیونکہ مفتوح ملک سے سب سے پہلے خراج میں گھوڑے ہی وصول کیے جاتے تھے۔ اس لئے بسا اوقات سپاہی لڑائی کے فتح ہونے پر عموماً سوار بن جاتے تھے۔ پیادہ فوج تمام فوج میں کم تر سمجھی جاتی تھی اور صرف قلعوں کی محافظت اور چھاؤنیوں کی نگہبانی پر مقرر کی جاتی تھی۔ لڑائی میں سکھ ہمیشہ سوار فوج سے کام لیتے تھے۔ صرف اکائیوں کی پیادہ فوج کی وقعت کی جاتی تھی۔ یہ معتقدین کی ایک فدائی جماعت تھی جو گہرے نیلے رنگ کے کپڑے پہنتے اور گپڑیوں میں اپنے چکر لگا یا کرتے تھے جو کچھ تو خوبصورتی کے لئے اور کچھ ہتیار کا کام دیتے تھے گو وہ زیادہ موثر ثابت نہ ہوتے تھے۔

ان کی دوسری امتیازی علامت یہ تھی کہ گپڑی میں چاقو کھسا ہوا ہوتا تھا۔ گردن میں تلوار لٹکی ہوئی اور ہاتھ میں ایک چوبی عصا ہوتا تھا۔ یہ لوگ بھنگ کے نشے میں چور جوش میں آکر سب سے پہلے شہروں پر دھاوا کرتے اور بسا اوقات کارنامے نمایاں انجام دیتے تھے۔ لیکن یہ بالکل بے تربیت اور ناقابل اعتماد تھے اور مسلح کے زمانے

میں تو ان کی آزادی کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ سکھوں کا ہتھیار تلوار تھی جس کے استعمال میں سوار خصوصاً مشاق تھے۔ پیادہ فوج تیر کھار، اور بہت کم بندوق سے کام لیتی تھی لیکن بارود بہت کم دستیاب ہوتی اور سکھ اس کے استعمال کو زیادہ پسند نہ کرتے تھے اور عموماً بندوق پر ہاتھ رکھتے ہوئے ان کو خوف معلوم ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے ان میں توپ خاصہ نہ تھا۔ گورنجیت سنگھ نے فرانسیسی اور اطالیہ کے عہدہ داروں کی مدد سے بہت زبردست و باقاعدہ توپ خانہ قائم کیا تھا تاہم آخر وقت تک سکھ اس خدمت سے متنفر رہے اور مسلمان عموماً اس کام پر مامور کیے گئے۔ مالی غنیمت عموماً مساوی طور پر تمام سپاہیوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ اگر کوئی شخص محروم ہوتا تو اس کو معاوضہ دیا جاتا اور مقتول کے فرزند یا قریبی رشتہ دار کو اس کی جگہ مامور کیا جاتا تھا۔

سردار یا امرا اپنے خاندانی ناموں سے مشہور ہوتے تھے اور یہی ان کو ایک دوسرے سے ممیز کرتے تھے کیونکہ ہندو ناموں کی تعداد کم تھی اور سنگھ کا لقب عام تھا عموماً یہ اضافہ یا توجائے پیدائش کے لحاظ سے ہوتا تھا یا اس شہر کے نام پر جسے انھوں نے فتح کیا ہو مثلاً جاسنگھ اہلووالہ، بیض اوقات ذاتی خصوصیت و اوصاف کے لحاظ سے خواہ وہ اچھے ہوں یا برے مثلاً ندان سنگھ پنج ہشتہ (راجہ ہاتھ والا) بلحاظ قوت جو میدان جنگ میں ظاہر ہوتی تھی (لہنا سنگھ جمنی) (پست قد ہونے کی وجہ سے)۔ مہر سنگھ لہبا (دراز قد) شیر سنگھ کھلہ (بیوقوف) کرم سنگھ زلا (بے عیب) اور اسی طرح کے سیکڑوں نام جن سے سکھوں کی تاریخ بھری پڑی ہے اور جو آج تک خاندانی نام کی حیثیت سے باعث افتخار تصور کیے جاتے ہیں۔

باب پنجم

مہاراجہ

کوئی تیاج پنجائیں جا کر مہاراجہ کی شکل و شمائل اور خصوصیات سے ناواقف نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ اس کی وفات کو نصف صدی کی مدت گزر چکی ہے پھر بھی صوبے بھر میں اس کا نام گھر گھر زبان زد ہے اور بڑے بڑے محلوں سے لے کر جھوپڑیوں تک میں اس کی تصویریں لٹکائی جاتی ہیں۔ امرتسر و دہلی کے نقاش ہاتھی دانت پر اس کی تصویر بنایا کرتے ہیں۔ ان تصاویر میں وہ ادھیڑ یا سن رسیدہ دکھایا جاتا ہے۔ اس کے شباب یا جوانی کی تصویر بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ ابتداء لاہور کے دربار میں نقاشی اور دوسری عمدہ صنایعوں کی کچھ ایسی قدر نہ تھی۔ بڑھاپے میں رنجیت سنگھ کی تصویر کچھ خوش نما نہ تھی لیکن اس کی صورت میں کوئی ایسی بات تھی جسے کوئی بھول نہیں سکتا تھا۔ سخت محنت اکثر معرکہ جنگ کے ہنگاموں میں جہاں جو کھوں کے موقعوں پر موجود رہنے۔ شراب خواری و عیاشی نے اسے قبل از وقت بڑھا کر دیا تھا اور پچاس سال کی عمر میں وہ بوڑھا اور ضعیف بیکار اور مضمل ہو گیا تھا۔ اسی زمانے کے بہت سے لوگوں نے اس کا طلیہ بیان کیا ہے اور منجملہ بیرن ہیوگل کا بیان بھی جو یہاں لکھا جاتا ہے صحیح اور ہو بہو ہے۔

وہ کوتاہ قد اور کمزور تھا اور اگر وہ اپنی اعلیٰ ذہانت و قابلیت سے ممتاز نہ ہو گیا ہوتا تو کوئی نظر اٹھا کر بھی اس کی طرف نہ دیکھتا۔ میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ پنجاب میں اس نے اس سے زیادہ کوئی بد صورت اور کمزور شخص نہیں دیکھا۔ اس کی بائیں آنکھ سے جو بالکل بند ہے اس کی دہنی آنکھ نے اس کی صورت زیادہ بگاڑ دی ہے جو ہمیشہ غلہ سی کھلی اور پھرتی رہتی ہے اور بیسہاری کی وجہ سے ابھی بھی ناک اور ٹیڑھی ہو گئی ہے۔ اس کے چہرے پر چپک کے داغ ایک دوسرے سے ملے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ہر داغ ایک علیحدہ گڑھے کی صورت میں اس کے گلجھویں گندمی رخسار سے پر نمودار ہے۔ اس کی چھوٹی سیدھی ناک آگے سے موٹی ہے۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹ دانتوں سے ملے ہوئے ہیں۔ گردانت اب تک اچھے ہیں۔ اس کی

کڑا بڑی ڈاڑھی کٹوں پر اور مونچھ گھنی تھیں ٹھڈی کے نیچے دونوں گندہی ہوئی ہیں۔ اس کا سرجو جوڑے شانوں میں سے بالکل دھنسا ہوا ہے اس کے قد کی مناسبت سے بڑا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بے آسانی جنبش نہیں کر سکتا۔ اس کی گردن موٹی اور پُر گوشت ہے۔ اُس کے بازو اور ٹانگیں ڈبلی ہیں۔ بایاں ہاتھ اور پاؤں دونوں جھولامارے ہوئے ہیں ہاتھ چھوٹے اور مضبوط ہیں بعض اوقات وہ آدھ آدھ گھٹنے تک کسی اجنبی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے رہتا اور اس کے دلی اعصابی ہیجان کا اظہار اس کی انگلیوں پر علی الاصل دباؤ پڑنے سے اسی شخص پر ہوتا رہتا ہے۔ اس کا لباس اس کی بد صورتی کو بڑھا دیتا ہے۔ موسم سرما میں سر کی پگڑی سے لے کر پاؤں کے موزے اور زیر پائی تک وہ زرد رنگ کا لباس پہنتا تھا۔ جب وہ معمولی انگریزی وضع کی کرسی پر پالتی مار کے بیٹھتا تو یہ نشست اس کے لیے اور بھی ناموزوں ہوتی ہے لیکن جب وہ گھوڑے پر بیٹھکے اور سیاہ ڈھال پشت پر ڈال کر سوار ہوتا ہے تو اس کی شکوہ تمام نمایاں ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی روح نے قالب کو زندہ کر دیا ہے۔ اس وقت ایک خاص شان نکلتی ہے جس کا وہم بھی نہ تھا کہ وہ ایسا ہے۔ باوجودیکہ اس کا ایک پہلو مغلوب ہو چکا ہے مگر کبھی بھی وہ گھوڑے کو نہایت آسانی سے قابو میں رکھتا ہے پڑ

یہ دل میں کھپ جانے والی شبیہ کچھ ایسی دل آویز نہیں ہے۔ ۱۸۳۷ء میں رنجیت سنگھ پر فالج گرا۔ لیکن اس واقعے کے قبل اگرچہ وہ کوتاہ قد تھا اور اس کا چہرہ اس منحوس بیماری (چیچک) کی وجہ سے بد رونق ہو گیا تھا جو بسا اوقات پنجاب کو خالی کر جاتی تھی اور اب بھی باوجود ٹیکہ لگائے جانے کے لوگ اُس کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ سپاہگری میں فرد کامل۔ مضبوط۔ اکھرے بدن کا۔ چست و چالاک۔ بہادر اور جفاکش شخص تھا۔ وہ بڑا شہسوار تھا اور دن بھر گھوڑے کی پیٹھ پر رہنے کے بعد بھی کبھی تھکن کے آثار اس کے چہرے سے نمایاں نہ ہوتے تھے۔ گھوڑے کا اس کو اس قدر شوق تھا کہ یہ شوق عشق کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ اس کا اصطبل نہایت وسیع تھا جس میں ہندوستانی عربی اور ایرانی نسل کے جانور جمع تھے اور جو اُس کے خاصے کے تھے۔ وہ بڑا شوقین شکاری تھا اور شہزادوں کے فن میں استاد تھا۔ ۱۸۳۱ء میں اس نے روپڑ کے مقام پر اپنے اور سکرن کے سواروں کا میخ اکھاڑنے اور تلووار لگانے کے کرتبوں میں مقابلہ کیا اور کامیاب رہا۔ اس کا لباس

بالکل سادہ ہوتا تھا۔ موسم سرما اور موسم بہار میں وہ عموماً زعفرانی رنگ کی کشمیر کی جامہ وار پہنا کرتا تھا اور گرمیوں میں سفید ململ کا لباس۔ وہ کسی قسم کے زیور و جواہر استعمال نہ کرتا تھا بجز خاص تقریب یا دربار کے موقعوں کے۔ اس قسم کی سادگی اکثر ایسے دیسی والیاں ملک و مدبران سلطنت میں پائی جاتی ہے جو دماغی قابلیت میں ممتاز ہیں۔ یورپین اشخاص کی طرح وہ بھی وحشیوں اور عورتوں کے مانند بناؤ سنگھار کرنے کو ناپسند کرتے ہیں اندور کے مہاراجہ بھاجی راؤ ہلکے۔ راجہ سر ڈکٹر راؤ اور ریاست نظام کے وزیر اعظم سر سالار جنگ عادتاً اپنے معمولی ملازمین کی طرح سادہ لباس پہنتے تھے۔ لیکن رنجیت سنگھ کو زیور اور جواہر کے استعمال کی ضرورت اپنے امتیاز ظاہر کرنے کے لئے نہ تھی۔ یہ امر تعجب نیز ہے کہ باوجود کمزوری اندھے پن اور مفلوج ہونے کے اپنے ذی شان ہیپ اور سرکش اُمرائے دربار پر اسے پوری پوری فوقیت حاصل تھی۔ فقیر عزیز الدین سے جو ۱۸۳۱ء میں لارڈ ولیم ہنگ کے پاس شملے سفیر بنا کر بھیجا گیا تھا ایک انگریز عہدہ دار نے دریافت کیا کہ مہاراجہ کس آنکھ سے کاٹا ہے۔ فقیر کے جواب سے اس کے دربار کی عظمت و شان اور درباریوں کے دل میں اس کی توقیر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ مہاراجہ کے چہرے پر ایسا رعب و دبدبہ ہے کہ میں نے کبھی نظر بھر کے اس کے چہرے کو نہیں دیکھا کہ معلوم کر سکوں کہ وہ کس آنکھ سے اندھا ہے؟

مہاراجہ میں بعض نہایت نمایاں اور مخصوص عظمت کے نشان وہی طور پر پائے جاتے تھے اور عام اخلاقی اصول و متحن طریق زندگی کے لحاظ سے اخلاق سے عاری تھا۔ اس کی فطرت میں درحقیقت وہ کمزوریاں اور عیب حد درجے کے موجود تھے جن کا نشو و نما انسان کے دل و دماغ میں اسی طرح ہوتا ہے جس طرح خود رو گھاس پھوس۔ اس کی اخلاقی زندگی بادی النظر میں بھی اس کی ظاہری جسمانی ہستی کی طرح حقیر اور کچھ تھی وہ خود غرض۔ جھوٹا اور حریص تھا وہ توہمات میں شدت سے مبتلا تھا اور علانیہ بے شرمی کے ساتھ شراب خواری و عیاشی کرتا تھا۔ اوصاف حمیدہ میں اسے کوئی حصہ نہیں ملا تھا لیکن باوجود اس کسی کے وہ بڑا شخص تھا۔ اس میں دوسرے بڑے حکمرانوں کی طرح جیسے قیصر۔ سکندر اعظم سے لے کے نپولین بونا پارٹ تک دماغی قابلیت کے ساتھ اخلاقی خوبی کی آمیزش نہ تھی۔ وہ اس وجہ سے بڑا تھا کہ اس میں غیر معمولی طور پر وہ اوصاف پائے جاتے تھے جن کے بغیر اعلیٰ درجے کی

کامیابی حاصل ہونا ناممکن ہے۔ ان اخلاقی خوبیوں کے نہ ہونے سے جو عائشہ خلائق میں پائی جاتی ہیں اس کے ممیز خصائل میں نہ تو کوئی ظلم واقع ہوا نہ کچھ کمی۔ وہ پیدائشی فرماں روا تھا اور اُس میں حکومت کرنے کا مادہ قدرت نے ودیعت رکھا تھا۔ لوگ بے چون و چرا اس کی اطاعت کرتے تھے کیونکہ اس سے سرکشی کرنے کا کسی کو مقدور نہ تھا۔ جو داب اس نے اپنے مرتے وقت تک، امرایجاری اور سکھوں کی عام جماعت پر قائم رکھا تھا اس سے اس کی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

انتہائی جرات و بہادری کے ساتھ اس میں استقلال اس بلا کا تھا کہ کسی مزاحمت سے اُس کے قدم کو لغزش نہ ہو سکتی تھی اور اسے مہمات میں ناکامیابی اس وجہ سے کبھی نہ ہوتی تھی کہ ناکامی کے امکان کا بھی اس کے دل میں کبھی خیال تک نہ آیا تھا۔ اس کی سیاسی دانٹمندی بہت بڑھی ہوئی تھی اور اس کا پٹن ثبوت اس سے زیادہ کسی امر سے نہیں ہو سکتا کہ جب اس نے دیکھا کہ انگریزوں کی دوستی سے ہر طرح کا امن اور دشمنی سے بہت خوف ہے تو وہ ان کی دوستی پر آمادہ ہو گیا۔ باوجود قوی ترغیبوں کے اور باوصف انگریزوں کی نہایت درشتی سے مزاحمت کرنے کے جس سے اُس کی تلج اس پار کے مالک کو فوج کرنے کی دلی تمنا بر نہ آئی تاہم اپنے دوران حکومت میں انگریزوں کے ساتھ اس نے رابطہ استحکام اور مضبوط رکھا اور اس کی اس قدیم دوستی کا اثر اس کے مرنے پر بھی ایسا مضبوط رہا کہ ہمارا جہ شیر سنگھ سا کمزور و شرابی راجہ بھی پنجاب میں شورش برپا ہونے اور افغانستان میں انگریزی فوج کی بربادی کے نازک وقت میں وفادار رہا۔ اس میں اور وصف ایسا تھا جو اکثر طباع اشخاص کے خصوصیات میں شمار ہوتا ہے۔ اور جس کے نہ ہونے سے بہت سے ذکی الطبع اشخاص ناکام رہتے ہیں یعنی ماتحتوں کے عمدہ انتخاب کا ملکہ۔ وہ لوگوں سے واقف تھا اور ہر ملازم کو اس کے حسب حال خدمت کے لیے منتخب کرتا تھا اور اسی وجہ سے ناقص و پر آشوب زمانے میں بھی حیرت انگیز طریقے پر اس کی تمام خدمتیں انجام دی جاتی تھیں اس کے طبعی حرص و طمع کا بدل حسن خدمات کے اعتراف و صلہ دیے میں فیاضی سے ہوتا تھا اور جو کچھ لوٹ مار کروہ لوگوں سے وصول کرتا تھا اسے نہایت فیاضی سے وہ پھر لوگوں کو بانٹ دیتا تھا۔ اس کے مقبول و منظور اشخاص کو بڑی بڑی جاگیریں یا محاصل کی مقدار و افزودی جاتی تھی اور اس کی ضرورت زیادہ تر

اس وجہ سے تھی کہ اُن لوگوں کو اس آمدنی کا حصہ کثیر فوج کی آراستگی میں صرف کرنا پڑتا تھا تاکہ سردار کے طلب کرنے پر فوراً وہ ضرورت پیدا ہو سکے۔ رنجیت سنگھ کے پاس جو کچھ تھا وہ دوسروں سے چھینا جھپٹا ہوا تھا۔ فیاضی اور حرص میں قربانی رشتہ ہے جیسا کہ مانٹی کارو یا قمار خانوں میں روزمرہ نظر آتا رہتا ہے۔

اگرچہ رنجیت سنگھ کے عیوب اور نقائص کا اخفا یا پردہ پوشی تاریخی سچائی کے منافی ہے تاہم خود اس کے یا ان معایب و نقائص کے متعلق اس وقت کی معاشرت پر غور کئے بغیر کوئی رائے قائم کرنا نادرست ہے۔ ہر زمانہ و ہر قوم میں نیکی کا ایک خاص معیار ہوا کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ جو بات آجکل معیوب و ناشائستہ تصور کی جاتی ہے وہ آگے چل کر سو سال بعد عام طور پر پسندیدہ خیال کی جانے لگے۔ تہذیب و شائستگی کے زمانے میں بھی عیوب کی حالت غیر مہذب زمانے سے کم نہیں ہوتی۔ تہذیب کی حالت میں صورت حال یہ ہوتی ہے کہ جب مکاری کی ضرورت پڑتی ہے تو بڑی عیاری سے ان عیبوں کی پردہ پوشی کی جاتی ہے اور اس طور پر نیکی بدی سے گویا ایک قسم کا خسراج تمسین حاصل کرتی ہے شاہانِ جاہ کے زمانے میں ہمارے آبا و اجداد بھی اسی طرح غلامیہ اور کثرت سے شراب خواری کرتے تھے جس طرح لاہور کے دربار کے سردار امرا کی طرح مے نوشی ضرب المثل ہو گیا تھا جس سے اٹھارہویں صدی کے انگریز امرا کی اخلاقی حالت و عادات کا پورا پورا اظہار ہوتا تھا۔ اب یہ رنگ بدل گیا اور لوگ بہت کم یا چھپ کر شراب پیتے ہیں۔ عورت و مرد کے تعلقات کے لحاظ سے پنجاب کی اخلاقی حالت حد درجے پرست تھی لیکن سنگھ یہ غدر پیش کر سکتے تھے کہ ان کے یہاں عورتوں کی حالت قدرتی طور پر بہت گری ہوئی تھی۔ اور مغربی ممالک کی طرح تعلیم اور دوسرے اثروں سے اُن کی وقت و غلط لوگوں کے دلوں میں جاگزیں نہ ہوئی تھی اور ایسی حالت میں عورت یا مرد سے عفت و عصمت کے بارے میں اعلیٰ خیالات کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ لیکن اگر ہم عصر تحریک کا کافی شہادت متصور کی جاسکتی ہے تو پیرس کی آجکل کی تمدنی حالت بھی ویسی ہی خراب ہے جیسی ۱۸۳۰ء میں پنجاب کی تھی اور لاہور کے بازاروں میں جب رنجیت سنگھ ہولی کا تہوار منایا کرتا تھا پکاؤلی کے شب کے ان نظاروں سے زیادہ شرمناک نہ تھے جو آئندہ میں نظر آنے تھے۔

بھی حال رنجیت سنگھ کے سیاسی طریقوں کا ہے۔ سکھ سردار میں ظلم و ستم مکر و فریب گویا ان کی سرشت میں داخل تھے۔ یہ اوصاف ان لوگوں کے پشت و پناہ و قوت بازو تھے جو ایک بد اخلاق اور اسی سوسائٹی میں جس کا اجتماعی شیرازہ بکھرا ہوا تھا ہر وقت حملوں کی مدافعت اور اپنی جان و مال کی حفاظت کرنے پر مجبور تھے۔ اگر شیر کو اس کے ناخن و دندان کے استعمال پر ملامت کرنا مناسب سمجھا جاسکتا ہے تو ہمارا جہ اور اُس کے دربار کے سرداروں کی فوجی اور سیاسی تالیخ کے مختصر غالب مکر و فریب کو اُن کے روزمرہ کی زندگی اور تعلقات کے لحاظ سے غیر معمولی و ناداراجی قرار دیا جاسکتا ہے۔ آج بھی افغانستان کا حاکم اپنے نظم و نسق کی بنا انھیں اصولوں پر قائم کرتا ہے جو رنجیت سنگھ کے تھے۔ تاہم سلطنت انگریزی جس کا وہ ماتحت اور فوج کی فراہمی کے لئے متعہد ہے اس بارے میں اعتراض نہیں کرتی کیونکہ وہ جانتی ہے کہ دُشمنی اقوام کے ساتھ سخت گیری کی ضرورت ہے اور یہ کہ اگر اور جماعت پر عقل اور قوانین کے ذریعے سے حکومت کی جاسکتی ہے تو دوسری قوم میں امن و امان کے قائم رکھنے کیلئے صرف پھانسی اور جلاد ہی کار آمد ثابت ہوتے ہیں۔ ہمارا جہ رنجیت سنگھ کے اطوار و خصائل کے بارے میں تصفیہ کرتے وقت ان امور پر خوب غور کر لینا چاہئے اور اس کو ان کا پورا فائدہ دینا چاہئے۔

اگر ہم اپنے دلوں سے تعصبات اور ظاہر داری کی نیکی کے خیال کو دور کر کے صرف اُن نادر اوصاف کو مد نظر رکھیں جن سے ایک شخص اپنے ہم عصروں میں ممتاز خیال کیا جاسکتا ہے تو ہم رنجیت سنگھ کو انسانوں پر حکمرانی کی ثبیت سے ایک ہیرو قرار دے سکتے ہیں اور اس مقام اعلیٰ پر جلوس کا مستحق قرار دے سکتے ہیں جو تاریخ نے ان مخصوص افراد کی عزت افزائی کے لئے معین کی ہے جن کی غطت کے متعلق کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہے۔ اگر ہم جذبے اور تعصب سے اپنے دل کو صاف کریں اور رسمی نیکیوں سے قطع نظر کر کے صرف اُن شاذ و نادر خوبیوں پر نظر رکھیں جو ایک سردار انسان کو بنی نوع پر فوقیت دیتی ہیں۔ اُس صورت میں ہم فوراً قائل ہوں گے کہ باوصف اس کے کہ وہ اپنے عہد کی عام اور بدنام برائیوں سے کما حقہ بہرہ یاب اور نقص تعلیم و تربیت سے متاثر تھا۔ اُس نے ایسے ملک پر حکومت کی جس کو اس کی فوجی ذہانت

اور عزم بالجزم فرمے کیا اور اس قابلیت کی وجہ سے اس صدی کے بہترین کی پہلی صف میں بٹھائے جانے کے قابل ہے۔

مہاراجہ کی خصلت کی بناغہ و غرضی پڑھی۔ اُس کے تمام ملازمین میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کے متعلق یہ کہا جاسکے کہ مہاراجہ اس کا شکر گزار اور گرویدہ تھا۔ اگر اس کلیہ کا کوئی استثناء تھا وہ جمدار خوشمال سنگھ تھا جس کی قابلیت اُس نے درجے کی اور عادتیں بہت مذموم تھیں۔ بایں ہمہ اس کے ملازمین اس کی خدمات کو اسس و فاداری سے بجالاتے تھے جس کا وہ کسی طرح مستحق نہ تھا۔ کپور تھلہ کے سردار فتح سنگھ کے ساتھ اس نے نامثنیٰ محبت کے اظہار کے لئے بھائی چارے کے طور پر گیلوی بدلی۔ یہ وہ شخص تھا جو ۲۰ سال تک جہات میں اس کا رفیق و شریک رہا تھا لیکن باوجود اسکے بھی اس کو اس کے مقبوضات سے بیدخل کرنے کی کوشش کی گئی۔ سردار مہری سنگھ نلوا جو اس کے سپہ سالاروں میں سب سے زیادہ جری اور تہور شعار تھا جب انہماؤں کی جھگ میں اُس کی خدمت کی انجام دہی میں مارا گیا مہاراجہ نے فوراً اُس کی پڑی جلاوطن پر قبضہ کر لیا اور اُس کے چاروں بیٹوں کو نسبتہ مفلوک الحال کر دیا۔ وہ سو روٹی دولت و عزت کو ناپسند کرتا تھا اور تارکوٹھیں سپرے قبضہ کی طرح سرفرازوں کی گردنیں ہمیشہ کاٹ دیا کرتا تھا۔ اوائل صدی میں سردار فتح سنگھ کلیان والہ تمام سکھ سرداروں میں سے ایک بڑا اور قوی سردار تھا ایک موقع پر وزیر آباد کے مقام پر رنجیت سنگھ نے اس سے کہا کہ اپنی فوج کو ایک طرف جمع کرو تا کہ وہ اس کی تعداد کا اندازہ کر سکے۔ مہاراجہ کو سخت ناگوار ہوا کہ موجودہ فوج میں سے تعداد کثیر فتح سنگھ کے جھنڈے کے نیچے ہے۔ یہ امر اُس کی آتش رشک کے بھڑکانے کو کافی تھا۔ ششہ میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سردار فتح سنگھ کے ہمراہی فوج کی کمان بذات خود اپنے ہاتھ میں لی اور نرائن گڑھ کا محاصرہ کیا۔ پندرہ روز تک بے سود محاصرہ کرنے کے بعد مہاراجہ نے سردار کو سرزنش کی کہ اُس نے اس ہم میں اتنی سرگرمی نہیں دکھائی جتنی کہ چاہئے تھی۔ اور کہا کہ میرا ساتھ ساتھ رہنا بہتر تھا تا کہ فوج کی کمان قرار داتی ہو۔ فتح سنگھ نے اس ناواجمی سرزنش سے غصے میں آکر فوراً قلعے کی فصیل پر جس میں ایک ٹنگاف ڈرگیا تھا حملہ کر دیا۔ مگر یہ ٹنگاف ناکارہ ثابت ہوا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کو پسپا ہونا پڑا اور اسی حملے میں مارا گیا۔ مہاراجہ کو اس طور پر

اپنے رقیب سے چھٹکارا نصیب ہوا اور اس نے اس کی تمام املاک فوراً کسی دوسرے سردار کو دے دی۔

سنگھ ریاستوں میں سے ایک رام گڑھیہا سل بہت طاقتور تھی۔ جب رنجیت نے اس کے قلع فتح کرنے کا منصوبہ ارادہ کر لیا تو اس کے پشوا سردار جو دھ سنگھ کے ساتھ بناوٹ سے محبت اور دوستی کا اظہار شروع کیا۔ اس نے اور رام گڑھیہا خاندان کے مابین رفاقت دوستی کا عہد و پیمان امرتسر کے مندر میں سکھوں کی مذہبی کتاب کے روبرو کیا اور اس عہد نامے پر شاہی ناخوندہ طریقے سے بجائے مہر اپنی بتیلی زعفران کے رنگ میں ڈبو کے چھاپا لگایا۔ کچھ عرصے تک اس معاہدے کی پابندی کی گئی کیونکہ جو دھ سنگھ اس کا رفیق تھا اور اس کی فوج اکثر مہمات میں کارآمد ثابت ہوئی تھی۔ لیکن سالہ میں جب اس سردار کا انتقال ہو گیا تو مہاراجہ کو اپنا کام کرنے کا موقع ہاتھ لگا۔ وزراء کو مذاوں میں وراثت کے تصفیے کے بہانے سے طلب کر کے ان کے زیر کار کا محاصرہ کیا اور سب کو قید کر لیا۔ پھر ایک زبردست فوج امرتسر روانہ کی اور رام گڑھیہا کی تمام جاگیریں پر قبضہ کر لیا۔

ایک دوسرے جو دھ سنگھ کے ساتھ بھی جو ایک مشہور بہادر اور جنگجو شخص اور وزیر آباد کا سردار تھا اس نے اسی قسم کا برتاؤ کیا۔ مہاراجہ نے یہ سمجھ کر کہ وہ اس قدر طاقتور ہے کہ اس پر حملہ کرنا مشکل ہے اسے دوستانہ ملاقات کے لئے لاہور میں مدعو کیا جو دھ سنگھ رنجیت سنگھ کے منصوبے کو ناگ کیا اور اس لئے وہ فوج کی ایک کثیر تعداد اپنے ہمراہ لیتا آیا۔ رنجیت سنگھ نے اس سے درخواست کی کہ وہ فوج کو واپس بھیج دے۔ اور اس نے بھی غرور و نخوت کی وجہ سے اس فرمائش کی تعمیل کی۔ دوسرے دن وہ صرف بیچیں ہمراہیوں کے ساتھ دربار میں حاضر ہوا اور اپنے ساتھیوں کو باہر چھوڑ کر خود اندر داخل ہوا۔ مہاراجہ نے بڑے تپاک سے اس کی آویختگی کی لیکن تھوڑی ہی دیر بعد دفعتاً کھڑے ہو کر اپنے آدمیوں کو اس کے گرفتار کرنے کا اشارہ کیا۔ جو دھ سنگھ تناؤ اور کھینچ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ جنگ کے لئے تیار ہو جائیں کیونکہ وہ کبھی زندہ گرفتار نہ ہو گا اور اس نے کبھی دشمن کے مقابلے میں پیٹھ نہیں دکھلائی۔ اس کی اس جرأت و دلیری کا مہاراجہ کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ اس نے

بعزت و احترام اس کو پیش بہا تحفے و تحائف دیکر نصرت کیا اور اس کی ریاست میں اور اضافہ کر دیا۔ یہاں تک تو رنجیت سنگھ اور جو دھ سنگ دونوں کا طرز عمل قابل تحسین رہا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد جو دھ سنگ کی چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کے فوت ہو گیا تو ہمارا جہ نے اس کی تمام املاک پر قبضہ کر لیا اور اگرچہ اس نے یہ وعدہ کیا تھا کہ بڑے لڑکے کے سنی بلوچ کو پہنچنے پر وزیر آباد اس کو واپس دیدیا جائیگا لیکن اس وعدے کا ایفا کبھی نہ ہوا اور غالباً اس نے ایفا کرنے کی نیت سے وعدہ بھی نہیں کیا تھا۔

کسی سردار کے لئے اپنے حوال کا اظہار خطرہ سے خالی نہ تھا۔ جب بٹالہ کے نوجوان سردار نے اپنی بہن کی شادی سردار شیر سنگھ سے کی تو دونوں خاندانوں نے اس تقریب میں دو لاکھ روپے صرف کئے ایسے جن گنگل نولہ کے ضلع میں اس سے قبل کبھی دیکھنے میں نہ آئے تھے۔ رنجیت سنگھ نے جب اس واقعے کو سنا اور لڑکی کی ماں کے اس ڈینگ مارنے کا حال اسے معلوم ہوا کہ اس کے پاس دو پروٹے روپے کے بھرے ہوئے ہیں تو اس نے فوراً اسے طلب کر کے کہا کہ جو خاندان شادیوں پر اتنا روپیہ صرف کر سکتا ہے اسے یقیناً پچاس ہزار روپیہ مجھے دینا کچھ گراں نہ گزرے گا۔

باوجود اس درجے حریفوں اور طاع ہونے کے رنجیت سنگھ ظالم یا خونخوار نہ تھا۔ جب کسی قلعے پر قبضہ کر لیتا تو مفتوحین کے ساتھ لطف و ملامت سے پیش آتا خواہ انھوں نے کتنی ہی شدت سے اس کا مقابلہ نہ کیا ہو۔ اس کے دربار میں بہت سے سردار ایسے تھے جن کی ریاستیں اس نے چھین لی تھیں لیکن ان کو ان کی حسب حیثیت خدمت سپرد تھی اور یہ لوگ اپنی قسمت پر شاکر تھے یہی نتیجہ شرعی جبروت کا ہے جس سے منلو بیت کا صدمہ مٹ جاتا ہے۔ یہ سردار مختلف ریاستوں کے پیشوا و فرمانروا تھے جنہیں اس نے تباہ کر دیا تھا۔ وہ مساوات کے درجے سے گھٹا کر اس طرح بہ عزت و احترام ماتحت بنائے گئے تھے۔ ان کے علاوہ مسلمان خاق و دوسرے شرفا تھے جنہیں گو بنہ سنگھ سے بھجنا ت ملنا دشوار تھی جن کو گو بنہ ایک مختصر توبہ کی مہلت کے سوا کچھ نہ دیتا لیکن رنجیت سنگھ نے دانشمندی سے انہیں اپنا وابستہ دولت کر لیا تھا اور اس طور پر

مغربی اضلاع میں اس کا اثر بہت کچھ بڑھ گیا تھا۔ مسلمانوں کے قبائل سیالی۔ گھیا ٹوانہ۔ کھل اور ملتان کے نواب مظفر خاں کا خاندان ان لوگوں میں شامل تھے۔

رنجیت سنگھ نے جس طرح سے دنیا کا مشہور ہیرا کوہ نور حاصل کیا اور بلی نامی گھوڑی جو پشاور کے افغان صوبہ دار کی ملک تھی اور جو اس زمانے میں کوہ نور سے کم اس کی شہرت نہ تھی جس طور پر اس کے قبضے میں آئی اس سے اس کی بدیتی دھٹ کا کافی ثبوت ملتا ہے اور بجائے اس کے ان واقعات کا ذکر خالص تاریخی باب میں کیا جائے اسی باب میں اس کا تذکرہ زیادہ مناسب ہے۔

کوہ نور اس درجہ مشہور ہے کہ اس کے مزید حالات لکھنے کی ضرورت نہیں پائی جاتی۔ اس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہندوؤں کے وہی اور خیال بزرگ پانڈوں کے قبضے میں تھا۔ اس کے بعد سے سوٹھویں صدی تک اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ مگر اس وقت وہ پھر صفیہ تارینخ پر بندہ دار ہوا اور شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے تحت و تاج کی زیب و زینت بنا۔ اس کے بعد مشہور قزاق بادشاہ نادر شاہ نے دہلی کے لوٹ میں اس پر قبضہ کیا۔ اس کے قتل ہونے کے بعد یہ بیش بہا جوہر احمد شاہ ابدالی کے ہاتھ آیا۔ اور ۱۷۴۷ء میں جب رنجیت سنگھ کو اس کے حصول کا موقع ہاتھ لگا تو وہ شاہ شجاع معزول امیر کابل کے قبضے میں تھا جس کو اس کے بھائی نے ملک بدر کر دیا تھا اور وہ پنجاب میں جلادطن ہو کر آیا تھا۔ رنجیت سنگھ نے کچھ تو سیاسی مصالح کے لحاظ سے یہ سمجھ کے کہ ممکن ہے اسے کوئی ایسا موقع ہاتھ لگ جائے کہ جس سے وہ افغان غاصب کے خلاف اسی سے کام لے سکے اور زیادہ تر اس غرض سے کہ مشہور ہیرا اس کے قبضے میں آجائے شاہ شجاع کو لاہور میں پناہ دی۔ سکھ مورخین نے یہ بیان کیا ہے کہ شاہ شجاع کی بیوی شاہ بیگم نے رنجیت سنگھ کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر وہ اس کے خاوند کی حفاظت کرے اور اس کے جانی دشمن پشاور کے صوبہ دار فتح خاں کو اس کے حوالے نہ کرے تو وہ اسے کوہ نور ہیرا دے گی۔ اور رنجیت سنگھ نے فوراً اس تحفے کو قبول کیا اور اپنے معتمد فوجی افسر حکیم چند کو روانہ کیا کہ معزول شدہ شاہ کو بہ عزت و احترام لاہور لے آئے۔

شاہ شجاع نے جو واقعات بیان کئے ہیں وہ اس سے بالکل مختلف ہیں۔ اس کا بیان ہے کہ کوہ نور کا اس وقت تک کوئی ذکر نہ آیا جب تک کہ رنجیت سنگھ نے

اُسے لاہور میں بلا کر اُس حویلی میں نہ اتار لیا جو اس کے قیام کے لئے لاہور میں منتخب تجویز ہوئی تھی۔ لاہور آنے اور قیام کرنے کے بعد ہیرے کا مطالبہ نہایت درشتی کے ساتھ کیا گیا غریب شکست خوردہ بادشاہ نے ہیرے کے اپنے پاس موجود ہونے سے قطعی انکار کیا۔ رنجیت سنگھ نے دوبارہ پیغام بھیجا اور اس کے معاوضے میں بڑی جاگیر دینے کا وعدہ کیا۔ شاہ شجاع نے مکر یہ کہلا بھیجا کہ وہ ایک صراف کے پاس امانت رکھوا دیا گیا ہے لیکن اس میں اور مہاراجہ میں دوستی کا تہجد اور کامل اطمینان ہو جائیگا تو اس وقت وہ اس کے حوالے کر دیا جائیگا۔ رنجیت سنگھ کو اس جواب سے سخت غصہ آیا اور شرعی طریقہ جہان داری کو فراموش کر کے اس نے افغان کی جاے سکونت پر پیر اٹھادیا۔ اور ہر ایک شخص کی جو اس مکان سے باہر جاے تلاشی یعنی شروع کی۔ کھانا بھی اس نے بند کر دیا جعلی خطوط پیش کئے گئے جن کے متعلق یہ بیان کیا گیا کہ وہ راستے میں رد کئے گئے ہیں اور انہیں شاہ شجاع نے اپنے افغانستان کے احباب کو دعوت دی تھی کہ وہ ہندوستان پر حملہ کریں اور اس کو قید سے رہائی دلوائیں پڑ

شاہ شجاع کو گو بند گروہ کے قلعے میں اسیر کرنے کی دھمکی دی گئی۔ آخر کار دو مہینے تک رافعت کرنے کے بعد جب شاہ شجاع نے دیکھا کہ اسے لگاتار پریشان کیا جا رہا ہے اور اس کا خاندان و ملازمین بھوک سے تنگ آ گئے ہیں اور اگر انکار جاری رہا تو اسے قید یا موت نصیب ہوگی تو اس نے ہیرا دینے کا اقرار اس شرط پر کیا کہ مہاراجہ قسم کھا کر اس کی حفاظت و دوستی کا وعدہ کرے اس کے لئے مہاراجہ ہر وقت تیار تھا۔ چنانچہ سادہ مرتب کیا گیا جن میں ادی گرنٹھ اور دسویں گرو کے گرنٹھ کی قسم کھا کر اس نے یہ وعدہ کیا کہ وہ ہمیشہ شاہ شجاع کا دوست رہیگا اور اس کو کابل کا تخت دلانے کی پھر کوشش کریگا۔ اس کے بعد شاہ شجاع نے رنجیت سنگھ کو بذات خود آکر ہیرا لے جانے کے لئے مدعو کیا۔ مہاراجہ صرف چند ہمارہیوں کے ساتھ گیا۔ گھنٹے بھر تک سکوت کا عالم رہا اس کے بعد مہاراجہ نے اپنے نئے دوست و قیدی کو اپنے آنے کی وجہ سے مطلع کیا۔ شاہ شجاع نے ایک ملازم کو ہیرا لانے کا حکم دیا۔ ایک گٹھری سامنے لائی گئی اور جب وہ کھولی گئی اور مہاراجہ نے اس بات کا اچھی طرح اطمینان کرایا کہ وہ وہی ہیرا ہے جس کے حصول کی اسے اس درجہ تمنا تھی تو اس نے اسے نہایت بے تابی سے اٹھالیا اور بغیر

خصمت ہوئے وہاں سے اٹھ کر یہ علاقہ معاہدہ صرف یہیں ختم نہیں ہوا۔ بلکہ کچھ عرصے کے بعد جب اسے یہ معلوم ہوا کہ ان نوواردوں کے پاس اب بھی نادر الوجود جواہرات ہیں تو اس نے بھائی رام سنگھ اور اپنی ایک بیوی کو بھیجا کہ تمام گھر یہاں تک کہ شاہ شجاع کے زمانے کی بھی تلاشی لے کہ جس قدر جواہرات دستیاب ہوں ساتھ لے آئیں۔ اس حکم کی تعمیل کی گئی اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی بیوی نے شاہ شجاع کی بیگماتہ اور اس کے خواصوں کی بھی جامہ تلاشی تک لی اور کچھ قیمتی سامان ملا وہ سب مہاراجہ کے پاس بھیج دیا گیا۔

۱۸۴۹ء تک کوہ نور لاہور میں رہا۔ پنجاب کے الحاق کے وقت بغرض اظہار اطاعت

یہ میراٹک مظہر کے نذر کیا گیا۔ اور حق یہ ہے کہ اس جنگ میں جس کے لڑنے کے لئے انگریزوں کو سکھوں نے مجبور کیا تھا فتح یابی کے خیال سے قطع نظر کہ کبھی یہ ہمہ سہرا شاہان مغلیہ کے جہانگیر ہونے کی حیثیت سے ملکہ و کٹورہ کو ہی وراثتاً پہنچتا تھا۔ لیکن نامی گھوڑی کے واقعات مختصر بیان کئے جاسکتے ہیں۔ یہ گھوڑی اپنی خوبصورتی کی وجہ سے افغانستان و پنجاب میں مشہور تھی۔

۱۸۳۶ء میں منجیت سنگھ نے اس کے مالک سردار یار محمد خاں صوبہ دار پشاور کے پاس پیغام بھیجا کہ گھوڑی اس کے حوالے کر دی جائے۔ سردار یار محمد خاں نے انکار کیا۔ فوراً سردار بدھ سنگھ سندھن والیہ کو بہترین سکھ فوجی انسٹرکٹڈ گھوڑی کو چھین لانے کے لئے روانہ کیا گیا اور اسی کے ساتھ اس کو خلیفہ سید احمد پر حملہ کرنے کا حکم دیا گیا جو پشاور کی پہاڑیوں میں سکھوں کے خلاف جہاد کا وعظ کر رہے تھے۔ سردار بدھ سنگھ نے دشمن کو شکست دی مگر جانین کا سخت نقصان ہوا اس کے بعد جب وہ پشاور پہنچا تو معلوم ہوا کہ لیلی مرگئی ہے۔ اس کے لاہور

واپس آنے پر معلوم ہوا کہ یہ افواہ غلط تھی ایک دوسری فوج پھر شہزادہ کھڑک سنگھ کے برائے نام سرکردگی میں پشاور روانہ کی گئی اور اسے حکم دیا گیا کہ یا تو گھوڑی واپس دیکر خریدے یا زبردستی چھین لے اور اگر یار محمد خاں اسے ہر طرح دینے سے انکار کرے تو اسے پشاور کی صوبہ داری سے معزول کر دیا جائے۔ کھڑک سنگھ نے پشاور کی طرف کوچ کیا۔

یار محمد نے جب یہ دیکھا کہ گھوڑی دینے سے اس کی آبرور پر حرف آئے گا تو وہ پہاڑیوں میں بھاگ گیا۔ کھڑک سنگھ پشاور میں آٹھ مہینے تک قیام کرنے کے بعد واپس آ گیا اور سردار سلطان محمد خاں کو وہاں صوبہ دار مقرر کر دیا۔ لیکن سکھوں کی فوج ابھی تک

بھی نہ پہنچی ہوگی کہ یار محمد خاں نے ولہاس اگر نئے صوبہ دار کو نکال باہر کیا۔ جنرل ونٹور اکو جس کے زیرِ کمان ایک میں سکھوں کی فوج تھی مہاراجہ کی طرف سے حکم دیا گیا کہ گھوڑی کے حاصل کرنے کے متعلق کارروائی کر کے اپنی قسمت آزمائی کرے اس کے لیے جس قدر قیمت وہ مقرر کرے گا وہ منظور کی جائے گی اور اگر اس طور پر دینے میں انکار کیا جائے تو پھر لڑائی شروع کر دی جائے۔ یار محمد خاں ابھی جواب دینے میں پس و پیش کر رہا تھا کہ خلیفہ سید احمد نے پہاڑ سے اتر کر پیشاور کے شمالی دیہات میں لوٹ مار شروع کر دی۔ صوبہ دار خلیفہ کے نکالنے کی کوشش میں مارا گیا۔ لیکن مرنے سے پہلے اس نے یسلی کو حوالہ نہ کیا تھا۔ جنرل ونٹور خلیفہ سید احمد کو شکست دے کر پیشاور کے روہر و لشکر لیے پڑا رہا اور سلطان فتح محمد خاں سے گھوڑی کا مطالبہ کرتا رہا۔ سلطان محمد خاں سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر وہ گھوڑی دیدے تو صوبہ داری پر اسے مستقل کر دیا جائے گا۔ سلطان محمد بھی اپنے بھائی کی طرح لیت و لعل کرتا رہا اور اس وقت تک یسلی حوالہ نہ کی گئی جب تک کہ ونٹور نے خود اس کے محل میں اسے گرفتار کر کے اس وقت تک مقید رکھنے کی دھمکی دی جب تک یسلی حوالے نہ کی جائے۔ استقلال سے بالآخر کامیابی نصیب ہوئی جس کا وہ متحقی تھا۔ اور جنرل ونٹور کو وہ گھوڑی ہاتھ لگ گئی جس کے حصول کی بڑی تمنائھی۔ گھوڑی لاہور پہنچائی گئی اور مہاراجہ نے اس کے ملنے کی بڑی خوشی کی بڑی باتک یہ امر مشکوک ہے کہ آیا اصل گھوڑی اس کو دی گئی یا نہیں۔ افغان ایسی ذات ہیں کہ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنہیں وہ دھوکا نہ دیں یا نہ دے سکتے ہوں۔ اسی لئے میں جب روپڑ میں مہاراجہ گورنر جنرل سے ملنے گیا تو ایک سبزہ گھوڑی اسے دکھائی گئی جو یسلی بیان کی گئی۔ ہیوگل جب لاہور گیا تو اس نے خاص طور پر اس مشہور گھوڑی کے دیکھنے کی استدعا کی جس کے متعلق مہاراجہ کا بیان تھا کہ اسے حاصل کرنے کے لیے اس کو ساٹھ لاکھ روپیہ خرچ اور بارہ ہزار آدمی کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اس نے یسلی کے حالات میں لکھا ہے کہ اس پر مغربی جھول پڑی ہوئی اور چاروں پیروں میں سونے کے کڑے تھے۔ وہ سبزہ رنگ تھی اور سیاہ دھبے اس کے جسم پر تھے۔ عمر میں تیرہ سال اور ناپ میں پوری سولہ ہاتھ تھی۔ نیٹور نے ہیوگل کو یہ باور کرایا کہ اس گھوڑی کے لیے پیشاد میں اس کو بہت کچھ مصیبتیں اٹھانا پڑی

تھیں۔ اس کے برخلاف سکھ مورخین کا بیان ہے کہ وہ گھوڑی تھی جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے اسی طرح اصلی سیال کی جنس بھی کہ وہ گھوڑی تھی یا گھوڑا تیار بھی چیتان ہے۔ بہر حال طرچینہ کے مفتوح ہونیکے بعد سرحد تک کسی گھوڑی کی بدولت اس درجے پریشانی نہیں ہوئی اور اتنی بہادر جانیں تلف نہیں ہوئیں۔ ہمارے لیے یہ انتہا شرمناک تھا اور اسی آتش سیال کے شوق اور انتشار نے آخر اس کی جان لی جس طرح بہت سے ہندوستانی والیان ملک کی جانیں گئیں جہاں عام رائے ایسی قوی نہیں ہوتی کہ والی ملک کو کثرت بے اعتدالی سے ہار رکھ سکے؟

بعض اشخاص جو اپنے ہوطنوں (یعنی انگریزوں) کی تحقیر کے عادی ہیں اسی امر کے مدعی ہیں کہ مے نوشی کا عیب ہندوستان میں پر دیسیوں کا پھیلایا ہوا ہے اور انگلستان کے ہندوستان کے فتح کرنے سے قبل ہندو پرہیزگار اور مے نوشی سے متنفر تھے۔ پنجاب یا سکھوں کی یہ حالت نہ تھی یہ لوگ ہمیشہ سے بدست تھے۔ باب ماسبق کے زمانے کو دیکھو جبکہ سکھ انگریزوں کے نام تک سے بالکل آشنا نہ تھے۔ لیکن میں پٹیلے کا راجہ امر سنگھ کثرت مے نوشی سے فوت ہوا جیسا کہ اس سے قبل اشارے میں اس کا باپ سردول سنگھ اور اس کا چھوٹا بھائی لال سنگھ اسی باعث سے ہلاک ہوئے تھے۔ بعد ازاں اسی طرح تقریباً ہر بڑے خاندان کے واقعات میں ایسی مثالیں ملینگی۔ تلوار و جسم دونوں مساوی طور پر فاصلہ امر کی تباہی کے باعث تھے؟

رنجیت سنگھ کی پسندیدہ شراب اناج کی تیز مقطر شراب تھی جس میں مالہم۔ افیون۔ مشک اور بہت سی دوسری مختلف جڑی بوٹیوں کی آمیزش ہوتی تھی۔ اس قسم کی شراب وہ سرشام اور شب کو بہ کثرت پیتا تھا۔ اس کے اکثر درباری باسقا فقیروں کے مسلمان خاندانوں کے اس کے خوش کرنے کو مے نوشی کے جلسوں میں شریک رہتے تھے اور اس کے مثل ہمیشہ بدست رہتے تھے۔ لیکن باوجود اس کثرت مے نوشی کے جو اس کے ملک و زمانے کے حسب حال تھی اور کوئی غیر معمولی امر تصور نہیں کی جاسکتی جہاں راجہ اوقات معینہ پر کام کرنے کے لیے مستعد اور ہوش میں رہا کرتا تھا۔ غیر ملک کے لوگ جو اس کے دربار میں آتے اس کی ذہانت۔ تشخیص اور عام معلومات کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔ اسے دوسرے ممالک کے طریقوں اور نظم و نسق کے بارے میں گفتگو کرنے اور یورپ کی افواج و لڑائیوں کا حال سننے میں سب سے زیادہ لطف آتا تھا۔ اجنبیوں کے ساتھ اس کا برتاؤ خالص طور پر دل آویز و متواضع تھا۔ جو سانسہ اس کے دور حکومت کے اواخر میں لاہور میں وارد ہوئے ان کے بیانات

بکثرت مشہور ہیں اُن سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ اپنے مقربین کو کس حد تک پائدار رہیہ کر سکتا تھا اور انہیں کی طرح جو تاریخ میں انتظامی قابلیت اور فوجی ذہانت کے لئے معروف اور ممتاز ہیں رنجیت سنگھ بھی عورتوں سے متاثر ہوتا تھا لیکن اس کا تجربہ ایسا نہ تھا جس سے پنجاب کی خواتین کے اطوار و اخلاق کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم ہو سکتی۔ اس کی دادی مائی دین کو اس کے باپ نے ایک برہمن کے ساتھ سازش کرنے کے جرم میں مار ڈالا تھا۔ خود رنجیت سنگھ نے اپنی ماں رانی راج کو راج کو جو مائی مالوائی کے نام سے مشہور تھی اسی قسم کے الزام پر تپل کیا تھا۔ خود اسکی بیویوں آشناؤں کے واقعات ایسے بدنام ہیں کہ یہاں پہیل تذکرہ بھی ان کا اعادہ کرنا نامناسب ہے۔ جب اس نے اپنے فرزند کھڑک سنگھ کے چہنیت وارث جازب انشین مقرر کئے جانے کا انتظام کر لیا تو اس نے زنانے کی ناشائستہ سازشوں کی طرف توجہ کرنا بالکل چھوڑ دیا۔ ان عورتوں نے اپنے بچوں کو کچھ تو سیاسی اغراض کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ اس طور پر اس کی نظر عنایت اپنی طرف مبذول کر لیں اس کی اولاد ہونا ظاہر کیا تھا۔ گو کہ اس زیرک مہاراجہ نے کبھی دھوکا نہیں کھایا۔ لیکن اس نے ان بچوں کو کسی قدر منحرف کے طور سے عموماً اپنی اولاد تسلیم کیا۔ اور وہ اکثر یہ پوچھا کرتا تھا کہ قسمت نے کیوں اس درجے غیر معمولی فیاضی اس کے ساتھ کی ہے اپنے بیٹے کھڑک سنگھ اور پوتے نونہال سنگھ کے پاس اس نے اپنے زنانے کی اکثر ایسی مستورات کو بھیجا جن کے اطوار مشتبہ تھے۔ ان ہی میں ایک خوبصورت ایسہ کور تھی جو کھڑک سنگھ کے مرنے پرستی ہونے کے لئے زبردستی مجبور کی گئی تھی۔

رنجیت سنگھ نے اٹھارہ عورتوں سے شادی کی۔ اُن میں نو کے ساتھ تو مذہبی مراسم ادا کیے گئے تھے اور باقی نو کے ساتھ معمولی چادر ڈالنے کی رسم ادا کی گئی تھی جس کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے۔ ان میں سے صرف چند کے حالات قابل ذکر ہیں۔

سب سے پہلی بیوی جہتاب کور تھی جس سے لاشعرا میں بیاہ کیا گیا تھا۔ اسی شادی کی بدولت رنجیت سنگھ اس درجہ برسر اقتدار ہوا کیونکہ یہ ایک با اقتدار کنہیا امیر جے سنگھ کی پوتی اور اس کی وارث تھی۔ اس کی ماں بیوہ سدا کور نے جو حقیقت ایک غیر معمولی عورت تھی اس امر کو سمجھ لیا تھا کہ اس کی لڑکی کا اثر قائم رہنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے خاندان کا وارث پیدا کرے اسی خیال سے اس نے مہاراجہ کی عدم موجودگی میں جب کہ وہ ایک ہم پر گیا ہوا تھا ایک لڑکے کو

لے رنجیت سنگھ کی تمام بیویوں اولاد جازب و ناجایز اسکے فرزند ہوتے اور جانشینوں کا پرہیز حال ہی میں خراج میں خیر کیا گیا۔

تلاش کر کے اسے اپنی لڑکی کی اولاد مشہور کیا۔ اس لڑکے کا نام ایسے سنگھ رکھا گیا لیکن وہ صرف دیرھ سال تک زندہ رہا۔ اب سدا کو رنے توام کی کوشش کی سترہویں سال میں جب مہاراجہ تلج اس پار کے ہم پر گیا ہوا تھا تو اس نے مشہور کیا کہ جنتاب کو یہ حاملہ ہے۔ اور جب مہاراجہ واپس آیا تو اس کے سامنے جنتاب کے دو توام بچے پیش کیے گئے ان میں ایک تو جلا ہے کا بیٹا تھا اور دوسرا مائی سدا کو کی ایک خواص کا۔ رنجیت سنگھ نے اول اول تو اس اولاد کے بارے میں ہر قسم کے اقرار سے بالکل انکار کیا لیکن دوسرے سال جب کہ وہ تلج اس پار کے محال میں انگریزوں سے تقریباً سر پکار تھا تو اس نے یہ مناسب سمجھا کہ اپنی زبردست ساس کی دلجوئی کرے جس کی بستی پر رام گر لھیا کے امرا تھے۔ اس نے ان توام لڑکوں کو اپنی اولاد تسلیم کر کے انھیں شاہزادوں کا مرتبہ دیا۔ ان میں سے ایک سارا سنگھ فائر العقل تھا۔ دوسرا شیر سنگھ بڑا بھلا خوش رو بہادر جوان تھا لیکن ساتھ ہی اول درجے کا بیوقوف بھی تھا نو نہال سنگھ کے بعد وہ تخت پر بیٹھا لیکن سترہویں صدی میں سندھن والی سرداروں نے اسے قتل کر دیا تو مہاراجہ کی دوسری بیوی راج کو ر تھی چونکہ کائی سردار رام سنگھ کی بیٹی تھی۔ ۱۹۸۰ء میں

اس کا بیاہ مہاراجہ سے ہوا اور چار سال بعد اس کے بطن سے کھڑک سنگھ پیدا ہوا۔ یہی صرف ایک جائز یا ناجائز اولاد تھی جو بیوی یا خواص کے بطن سے رنجیت سنگھ کے یہاں تولد ہوئی۔ کھڑک سنگھ بلا کسی مزاحمت کے اپنے باپ کے مرنے پر گدی نشین ہوا۔ یہ بہت کم عقل شخص تھا اور اپنے جاہ طلب فرزند نو نہال سنگھ اور جیون کے سازشی راجاؤں کے ہاتھ میں کٹ پتلی بنا ہوا تھا جنھوں نے اس سے پوری طور پر کام کمانے کے بعد اسے زہر دیکر مار ڈالا۔ نو نہال سنگھ اپنے باپ کے کر یا کرم سے فارغ ہو کر واپس ہی آ رہا تھا کہ اس کا بھی کام تمام کر دیا گیا تو

دوسری بیبیاں کچھ زیادہ قابل لحاظ نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک عورت جس سے ۱۸۳۳ء میں مہاراجہ نے مذہبی مراسم انجام دیکر بڑے دھوم دھام سے شادی کی گل بیگم نام امرتسر کی کسی تھی۔ مہاراجہ بھی کم عمر ہی تھا کہ ۱۸۳۸ء میں ایک دوسری کسی موران نے اسے اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ اور رنجیت سنگھ بدستی کے عالم میں ہولی کے جہوار میں ملن کو دھٹی پر اپنے پہلو میں بٹھا کر گشت لگاتا اور اپنے اس فعل پر کسی طرح نہ شرماتا تھا۔ اس عورت نے فیروز پور کی ملکیت کی سند حاصل کی اور اس کے مطیع کرنے کے لیے فوج روانہ کی لیکن کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ اہل ہند عام طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کو عورت سمجھے ہوئے تھے۔

اس کی تفسیک میں اس عورت کے نام و تصویر کا سکھ ڈھالا گیا؛
 دوسری عورت جو ہمارا جہ کے انتقال کے بعد مشہور بلکہ دراصل بدنام ہوئی وہ
 چندان ہمارا جہ ولیپ سنگھ کی مان تھی۔ وہ مناسنگھ نامی ایک لشکری کی بیٹی تھی اس کا باپ
 محل میں مامور تھا۔ یہ عورت رقص و نقالی کی وجہ سے ہمارا جہ کی منظور نظر ہوئی جسے اسنے
 اپنے محل میں داخل کر لیا۔ یہاں اس نے علانیہ اس قسم کی بد فعلیاں کیں کہ لاہور کا دربار بھی
 باوجود اس درجے آزاد اور بد اخلاق ہونے کے تعجب کرتا تھا۔ ایک ادنی ملازم سقا گلو نامی
 عام طور پر ولیپ سنگھ کا باپ مانا جاتا تھا۔ بہر حال رنجیت سنگھ اس کا باپ نہ تھا کیونکہ وہ
 اس لڑکے کی پیدائش سے کئی سال پیشتر مفلوج ہو چکا تھا۔ علاوہ بریں اس نے چند ان سے
 باضا بط یا بے ضابطہ کبھی میاہ بھی نہیں کیا تھا بہتوں کا تو خیال یہ ہے کہ ولیپ سنگھ چند ان
 کے بطن سے پیدا ہی نہیں ہوا بلکہ جمون کے راجاؤں گلاب سنگھ اور دھیان سنگھ کی کامیابی
 کے خیال سے وہ محل میں لایا گیا تھا۔ کیونکہ یہ لوگ چاہتے تھے کہ ہمارا جہ کے تمام در و زنا حقیقی
 یا غیر حقیقی کے برابر ہو جانے بعد کوئی ایسا لڑکا پیش کیا جاسکے جو اس کا جانشین بن جائے۔
 اور یہ تو یقینی ہے کہ چند ان اور اس لڑکے کو ایک عرصے تک جمون میں پناہ دی گئی۔ اور
 عین وقت پر ان کو پیش کیا گیا۔ بہر حال جو کچھ ہوشیر سنگھ کے مرنے پر جو فتنہ مچا اس سے
 دیگر کا ابال اوپر آ گیا تھا۔ چند ان نے مع اپنے آخری عاشق راجہ لال سنگھ کے اس فتنے
 میں نمایاں اور شرمناک حصہ لیا اور بالآخر اس کی اور اس کے اس نالائش عاشق کی بدستیاں ہی
 تھیں جنھوں نے سلج کی جنگ کرائی اور انجام کار سکھوں کی سلطنت کی بربادی کا باعث
 ہوئیں انگریز لڑائی کے بعد جب لاہور پہنچے تو ولیپ سنگھ جس کی عمر نو سال کی تھی برائے نام
 ہمارا جہ تھا۔ چونکہ حالات موجودہ کو برقرار رکھنا مناسب تھا اور ملک کے لئے کسی برائے نام
 حکمران کی ضرورت تھی کیونکہ انگریزی سلطنت کو اس وقت تک پنجاب پر مستقل قبضہ رکھنا یا
 الحاق کرنا منظور نہ تھا اس لئے خادمہ اور آب بردار کے لڑکے کو شیر پنجاب کے تخت پر
 بٹکن کیا گیا۔ تقدیر جس کا چرخ ہمیشہ گردش میں رہتا ہے اس انقلاب پر یقیناً خندہ زن ہوگی۔

باب ششم رنجیت سنگھ کا دربار

ہمارا راجہ رنجیت سنگھ کی طرف ہماٹ کا خشک بیان۔ ریاستوں کے الحاق اور غیرتوں کو مغلوب کرنے کے واقعات انگریزوں کو برا لگتے ہیں دلچسپ نہ معلوم ہوں گے کیونکہ انھیں اس امر کے معلوم کرنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ ہمارا راجہ کس طور و طریق کا شخص تھا۔ اس کی حیرت ناک کامیابی کے اسباب کیا تھے اور اس کے دربار کے سردار اور امرا کا کیا رنگ و ڈھنگ تھا۔ اس لیے اس باب میں اس کے خاص خاص درباریوں کا مرقعہ کچھ پینے کی کوشش کی جائیگی۔ ان میں سے بعض کے حالات ان کے حین حیات یا ان اطلاعات کی بنا پر اس سے قبل میں تحریر کر چکا ہوں جو ان کی اولاد و اجباب سے دستیاب ہوئے ہیں۔

ہمارا راجہ نہایت زیرک تھا۔ وہ اپنے ماتحت عہدہ داروں کے حالات ماقبل دریافت کرنے کی تکلیف گوارا نہ کرتا تھا۔ جب تک کوئی شخص کاروبار سلطنت یا فوجی ہماٹ بعد کی انجام دیتا اس وقت تک وہ اس کا مستند بنا رہتا اور اسے اس کا صلہ دیا جاتا تھا۔ جوں ہی وہ دیکھتا کہ اس نے خیانت یا وہ شخص جسے اس نے کسی خاص کام کے لیے انتخاب کیا جاتا اس کام کے ناقابل یا نامناسب ہے تو وہ حقارت کے ساتھ اُسے دور کر دیتا اور اس سے اس درجے بے تعلقی کرتا کہ ایسے مجرم کو سزا دینا اپنی کسر شان سمجھتا۔ اسلئے میں ملتان کی فتح کے بعد سلطنت مستحکم ہو گئی تھی اس کے بعد عام طور پر ہمارا راجہ کے عمل درآمد پر نظر کرنے سے حیرت ہوتی ہے کہ کیسے وفادارانہ طور پر اس کی خدمت انجام دی گئی اور اُس کے ماتحت کس قدر کم اُس کے خلاف ہوئے۔ یہ سچ ہے بناوٹ یا فربہ سے کچھ فائدہ نہ تھا کیونکہ سلطنت کا ہر صیفہ خراب تھا۔ عہدے دار جب تک شاہی خزانے میں مناسب مقدار حاصل داخل کرتے رہتے اس وقت تک

کاشتکاروں کے ساتھ جبر و تعدی کرنے کے متعلق کسی قسم کی باز پرس نہ کی جاتی تھی۔ جبر و تعدی کی روک صرف لوگوں کی مزاحمت سے ہوتی تھی جس کا پنجاب ایسے گرم مزاج میں سیاسی پیمانے کی حد میں نہ واقع ہونا یقینی تھا۔ ضلع جھلم کے جاٹ سکھ و مسلمان سرکاری دست برد کو ایک مہینہ و قدیم معمولی مقدار سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتے۔ جب اس سے زیادہ دست درازی کی کوشش کی جاتی تو ان کے اور ان کے جڑگوں کے ہاتھ فوراً تلوار کے قبضوں پر پڑ جاتے اور پھر بڑی دقتوں کا سامنا ہوتا۔

سکھ سرداروں کو جاگیریں بھی دی جاتی تھیں تاکہ وہ اس کی آمدنی سے فوج آراستہ رکھیں اور بد وقت ضرورت میں جاگیریں اس کے علاوہ یہ لوگ اپنے تابعین کی ایک مسلح رنگ برنگی جماعت کے ساتھ رکھتے اور اپنے ضلع میں شاہانہ تزک و احتشام سے اپنی حیثیت قائم رکھتے تھے۔ اکثروں کو انتظامی اغراض کے لئے ان کی جاگیروں کے علاوہ قطعات ملک تفویض کیئے جاتے تھے گو اس نظم و نسق کا مقصد صرف یہ تھا کہ موجودہ سرکاری تحصیل دسوں کی جائے۔ ایسی صورتوں میں عام کاروبار ساہوکاروں و گماختوں کے حوالے ہوتا تھا جنہیں سکھ سردار اپنی ذمہ داریاں تفویض کر دیتے تھے۔ یہ لوگ اپنی دستوری بمقدار کثیر وصول کر لیتے تھے اور ان کے آقا کبھی دریافت بھی نہ کرتے تھے کہ کس قدر قسم وضع کی گئی۔ جو حالت اس وقت پنجاب کی تھی وہی حالت اب بھی ہندوستان کی بعض جاگیری ریاستوں کی ہے۔ ہمارا جہت صیحا آنجنانی نے بہت سی وسیع ریاستیں اپنے درباریوں کو دے رکھی تھیں ان لوگوں نے کبھی ان جاگیروں میں قدم تک نہیں رکھا اور صرف یہ انتظام تھا کہ گواہیاں بالائے تمام محاصل انہیں پہنچ جایا کرے۔ ان دورانہ باندہوں پر ہر طرح کا جبر و تعدی اور بد عنوانی پھیلی ہوئی تھی۔ تمام مالی اور عدالتی انتظام کسی لالچی برہمن یا بنیے کے ہاتھوں میں ہوتا تھا جس کی برائے نام تھوڑی سی تھی اور جو آقا کے ساتھ تغلب تصرف اور رعایا سے دست درازی کر کے متمول بنا ہوا تھا۔

ہمارا جہ رنجیت سنگھ تو ہم پرست تھا لیکن دیندار نہ تھا۔ اسے زمانہ شباب کی آوارگی اور جوانی میں جہات کی مصروفیت سے نہ تو اتنی فرصت ملی اور نہ اس کا میلان قلب اس جانب ہوا کہ گرونانک کی لطیف دانشندانہ تعلیم یا گروگو بند کے پیچیدہ طریقہ زندگی کے احکام کو اخذ کر کے ان کی پابندی کرے۔ وہ ابن الوقت تھا موقع محل خوب دیکھتا تھا اسے

صرف وہ (مسئلہ) احکام پسند تھے جن سے وہ وحشی جاٹ رعایا پر اپنی حکومت کو استوار کر دے۔ چنانچہ اس نے مناسب موقعوں پر بڑے بڑے عیٹے سکھوں کے مسندروں و پوجاریوں کو دیئے اور بعض اہم پیشوایاں مذہب بابا اور بھائیوں کی اس کے دربار میں اچھی آؤ بھگت ہوئی۔ ان مذہبی بزرگوں کو جو زیادہ سے زیادہ سرسری طور سے تعلیم یافتہ تھے اور جو نانک کی صوفیانہ تعلیم سے اتنے ہی کم بہرہ ور تھے جیسے کہ آج کل کے سکھ پوجاری مذہب کی پابندی کا اسی وقت تک خیال رہتا تھا جب تک کہ عدم پابندی پر سکوت کرنے کے معاوضے میں انھیں معتد بہ رقم مل سکے۔ سکھ مذہب کا اصل اصول اسلام کو براہ کزناتھا۔ اس لئے مسلمانوں کو سلام کرنا ان سے میل جول رکھنا یا کسی شرط سے ان سے مصالحت کرنا ناجائز تھا۔ لیکن مہاراجہ کے بہت سے معتد و زرا اسی مذہب کے تھے جو مذہب سکھوں کے نزدیک قابل نفرت تھا۔ گرو گوبند سنگھ نے جسے ہندوؤں کے روحانی پیشواؤں یعنی برہمنوں نے ان کے اقتدار تسلیم نہ کرنے اور ذات پات کی قید اٹھا دینے کی وجہ سے مردود قرار دیا تھا ان برہمنوں کی ماموری صریحاً ممنوع قرار دی تھی۔ پھر بھی جمعدار خوشحال سنگھ۔ راجہ تیغ سنگھ۔ راجہ صاحب دیال۔ راجہ رلیارام۔ دیوان اجودھیہ پرنسہ۔ پنڈت شکر ناتھ اور بہت سے دوسرے ممتاز درباری برہمن تھے۔ مہاراجہ کی یہ بے لگے تعصبی سلہ پروائی اور خود غرضی پر مبنی تھی روشن خیالی کو اس میں بہت کم دخل تھا۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ مذہبی بے تعصبی کسی ملک یا زمانے میں کوئی مستحکم بنیاد رکھتی ہے۔ تعصب سخت اور جوش افزا عقائد کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور یہ مذہبی جنون اسی وقت جاتا ہے جب فک مذہب میں جگہ پاجانا ہے اور مذہبی جوش کی آگ کے شعلے ذرا دب جاتے ہیں بہر حال اس کی اصلیت کچھ ہی کیوں نہ ہو مہاراجہ کی آزاد خیالی کا اثر اس کی سلطنت کے نظم و نسق پر بہت اچھا پڑا اور دوسری سکھ ریاستوں نے بھی فوراً اس کی تقلید کی۔ گرو گوبند سنگھ کو جو تعصب منظور تھا اور جو مسلمانوں کے تعصب کی طرح خوفناک تھا آج کہیں پتہ نہیں چلتا۔ شیخ اس پار کی بڑی ریاستوں میں سے پٹیا لے میں تین حکمرانوں کے زمانے میں وزیر اعظم اور معتد خارجہ کے خدمات کو دو مسلمان شرفا خلیفہ سید محمد حسن اور خلیفہ سید محمد حسین نے بڑی خوبی سے انجام دیا۔ ان کی قابلیت ایمانداری اور کمال کے لحاظ سے کسی دہی ریاست میں کوئی شخص ان پر فوقیت نہیں رکھتا۔ سکھوں کی ریاستہائے کپورتھلہ ناہیہ اور جیند میں اسی مذہب کے عہدہ دار

معزز ذمے دار خدمات پر مامور ہیں۔ برہمنوں کے بارے میں گوبند سنگھ نے جو قاعدہ مقرر کیا تھا اس کے متعلق احتمال یہ ہے کہ ایک مذہبی رائے سے بڑھ کر اس کی کوئی وقعت نہیں کی گئی۔ کیونکہ ہندوؤں کی مذہبی حکومت نے ان لوگوں پر گہرا اثر ڈال رکھا تھا جو کبھی اسی زمرے میں شامل تھے اور وہ اس طوق غلامی سے اپنی گردنوں کو بھی رہا نہ کر سکتے تھے۔ سکھوں میں دلیر سے دلیر بھی علانیہ طور پر برہمنوں کی بزرگی کے خیال کو پامال کرنے کی جرات نہ رکھتا تھا۔ بہر حال سکھ مذہب کے احکام مذہبی کچھ ہی کیوں نہ ہوں یہ ناممکن تھا کہ انتظام سلطنت کی پیچیدہ رگیوں کو سلجھانے کے لئے مسلمانوں اور برہمنوں کو شریک نہ کیا جاتا کیونکہ یہی وہ لوگ تھے جن میں انتظام سلطنت کا موروثی مادہ موجود تھا۔

جمہوریت مساوات فہم کی خواہ کتنی ہی مدعی کیوں نہ ہو اور ذکی الطبع انخاص کی کتنی ہی مدح سرائی کیوں نہ کرے لیکن یورپ و امریکہ کی جمہوریتوں کے طرز عمل نے اسی اصول کو غلط ثابت کر دیا۔ حکومت ایک فن ہے جسے بلاشبہ غیر معمولی ذہانت کے انخاص کو بھی بغیر خاص تعلیم کے بھی کما حقہ مزاولت ہو سکتی ہے لیکن دوسرے کمالات کی طرح یہ بھی بڑی محنت و مشقت سے حاصل کی جاتی ہے اور موروثی مناسبت اور گروہ و خاندان کے حکمرانی قدامت اس کی کامیابی کے قوی اسباب ہوتے ہیں۔ اس طرح رغبت سنگھ کے زمانے میں صرف برہمن و مسلمان ہی انتظام حکومت سے ایک قسم کی موروثی مناسبت رکھتے تھے۔ برہمن ہندوؤں کے موجودہ سیاسی نظام کے موجد ہیں اور گوانھوں نے جگمگ فرقوں کو بڑی دانشمندی سے بادشاہی شان اور اس کے ساتھ ہی خطرات بھی تفویض کر رکھے ہیں لیکن اصل اقتدار انھوں نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ وہ بادشاہ کے روحانی پیشوا اور دنیاوی مشیر ہوتے ہیں۔ ان کے اقتدار کے روپر بادشاہ کا اقتدار ماند پڑ جاتا ہے۔ وہ سلطنت کرتا ہے اور یہ حکومت۔ یہی حالت مسلمانوں کی ہے۔ سیکڑوں سال تک ان کے حلوں کا سلسلہ جاری رہا اور انھوں نے ملک کو فتح کر کے اس پر ایک فوجی سلطنت کی حیثیت سے حکمرانی کی۔ مگر اس پر بھی وہ ان ہندو راجاؤں کی طرح جو ان کے پیشرو تھے برہمنوں سے پوری طور پر جھٹکارا حاصل نہ کر سکے۔ تاہم مسلمان بادشاہوں کے ملازم زیادہ تر ان کے ہم مذہب تھے جو یا تو حملہ آور فوج کے ساتھ آئے تھے یا اس کے سرداروں و عہدہ داروں کی اولاد تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اچھے خدمات پر مامور

ہو گئے۔ یہ لوگ ہندوؤں کی جماعت میں نہایت ہوشیار تھے کیونکہ فاتح کا مذہب قبول کر لینا اس امر کا بین ثبوت ہے کہ وہ غیر معمولی طور پر دانشمند اور زیرک تھے۔ ان ذہین تعلیم یافتہ اقوام کا غریب جاٹ کا تنکا بھلا کیا مقابلہ کر سکتے تھے جن کی سمجھ ان کی بھینس کی سمجھ سے ہرگز زیادہ نہ ہوتی تھی۔ دربار کی فضا میں سیاسی فتوحات اور ذہانت آزمائی سے انھیں کسی قسم کا تعلق نہ تھا۔ وہ اچھی جنائی کرنے اور لڑنے کے سوا اور کسی کام کے نہ تھے۔ برہمن اور مسلمانوں کی ذہانت کے مقابلے میں ان کی حالت بعینہ دیسی ہی تھی جیسے اکیل گھوڑے کے مقابلے میں کرایہ کا ٹٹو۔ ہمارا راجہ رنجیت سنگھ نے اس حقیقت کو اپنے ابتدائے زمانے میں محسوس کر لیا تھا۔ تختہء عین سردار فتح سنگھ کلیان والہ نے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے بستر مرگ پر پڑے ہوئے اس بارے میں اور بھی زور دیا تھا۔ فتح سنگھ اس زخم کی وجہ سے ہلاک ہوا جو نارائن گڑھ کے محاصرے میں لگا تھا جہاں اسے ناکامیابی نصیب ہوئی تھی۔ اس سردار نے یہ شورہ دیا تھا کہ کبھی کسی جاٹ سکھ کو دربار میں کوئی باقتدار خدمت نہ دی جائے اور فوجی خدمات کی حد میں رکھا جائے۔ یہ روایت خواہ صحیح ہو یا غلط یہ یقینی ہے کہ ہمارا راجہ نے اس اصول کو مدنظر رکھا اور اس پر عمل کیا۔ فوج میں بہادر سے بہادر ہمدرد دار جاٹ تھے لیکن مجلس شوریٰ میں برہمن راجپوت اور مسلمان یا کھتریوں پر مثل دیدار ساون تل بر اعتماد کیا جاتا تھا۔ جاٹ سکھوں کی خصوصیات میں اب بھی کوئی اصلاح نہیں ہوئی یا جو دیکھ انگریزی حکومت میں ان کی دوپیشیت گزر گئیں لیکن ان کی جو حالت اس وقت تھی وہی اب بھی ہے اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوئی وہ اب بھی تعلیم سے گھبراتے۔ عقل کے ٹھوس اور اپنے عادات و خیالات میں ویسے ہی ساوہ ہیں جیسے رنجیت سنگھ کے زمانے میں تھے جس نے انھیں کچھ عرصے کے لیے انھیں برائے نام ایک قوم بنادیا تھا۔

اجنبی جو رنجیت سنگھ کے دربار میں جاتے تھے ان کو سب سے نمودار شخص فقیر عزیز الدین وزیر خارجہ نظر آتا تھا۔ یہ شخص اور اس کے دونوں بھائی نور الدین و امام الدین بخارا کے ایک معزز خاندان کے تھے۔ اور اب تک اس ملک میں اس کی اولاد سکونت گزری ہے۔ اس کا باپ غلام محی الدین ایک ہوشیار طبیب تھا۔ ۹۹ء میں لاہور کے افسر لاطبا نے جس کے پاس عزیز الدین زیر تعلیم تھا اسے رنجیت سنگھ کے خدمتیوں میں مامور کرادیا۔

اس وقت لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد ہی رنجیت سنگھ کو آشوب چشم کی شکایت پیدا ہو گئی اس نوجوان حکیم نے جس ہوشیاری و توجہ سے اس کا علاج کیا اس سے رنجیت سنگھ کے دل میں اس کی عزت بڑھ گئی۔ عزیز الدین کو بہت سے دیہات عطا کیئے گئے اور وہ مہاراجہ کا خاص حکیم مقرر کیا گیا۔ اور جس طرح رنجیت سنگھ کے ملک و دولت میں اضافہ ہوتا گیا اُسی طرح عزیز الدین کی دولت اور جاگیروں میں بھی زیادتی ہوتی گئی۔ یہ اسی شخص کا دانشمندانہ اثر تھا کہ رنجیت سنگھ مشائخ میں انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کرنے سے باز رہا جب کہ انھوں نے سب سے اول اس کی قوت کو تلج کے شمالی فتوحات تک محدود کر دیا تھا۔ مہاراجہ عزیز الدین کے اس دانشمندانہ مشورہ کا اس درجے قائل ہوا کہ اس کے بعد کبھی کوئی اہم کام بغیر اس کے مشورے کے نہیں کیا۔ یورپین اور انگریزی حکومت کے متعلق ہر معاملے کا تصفیہ کرنے کے لیے عزیز الدین ہی کو مامور کیا جاتا تھا۔ اس شخص کی روشن خیالی اور آزادانہ مشورہ کی بدولت انگریزی حکومت کے اور مہاراجہ کے مابین رابطہ اتحاد آخر تک قائم رہا۔ فقیر عزیز الدین پر اس کو ایسا اعتماد تھا کہ مہاراجہ اکثر اپنی پوری فوج لیکر دور دراز مہمات پر چلا جاتا اور صرف چند آدمیوں کے ساتھ اسے لاہور کی حفاظت کے لیے چھوڑ جاتا۔ کبھی فقیر عزیز الدین فوجی خدمت پر بھی مامور کیا جاتا اور جب کبھی کسی خاص سفیر کے بھیجنے کی ضرورت ہوتی مثلاً ۱۸۳۷ء میں لارڈ ولیم ہنٹنگ کے پاس اور ۱۸۳۵ء میں امیر دوست محمد خاں کے پاس فقیر عزیز الدین ہمیشہ انتخاب کیا جاتا اور وہ اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرتا۔ ۱۸۳۷ء میں مہاراجہ کے گورنر جنرل سے روپڑ کے مقام پر ملاقات کے شہور تاریخی موقعے پر جو پارچہ طلائی کے میدان کی ملاقات کے نام سے مشہور ہے اور اسی طرح کے دوسرے یادگار و عظیم الشان ملاقات کے موقعے پر جو ۱۸۳۷ء میں فیروزپور کے مقام پر لارڈ آکلینڈ سے کی گئی تھی تمام ذمے داریوں کی خدمات فقیر عزیز الدین ہی کے تفویض ہوتی تھیں۔ وہ بڑا قابل اور رنجیت سنگھ کے درباریوں میں یقیناً سب سے زیادہ ایماندار اور دیاندار شخص تھا۔

عزیز الدین ایسا ملنسار اور آداب مجلس سے اس درجہ واقف تھا کہ بہت کم لوگ اس سے برسر پر خاش ہوتے گو اس میں شک نہیں کہ اس کی ترقی اور رسوخ کی وجہ سے لوگوں کو اس سے حسد ضرور تھا۔ باوجود مسلمان ہونے کے ہندو ریاست میں وزارت کی

خدمات انجام دیکر اس طسوح ہر دفعہ زیر رہنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ عقائد میں بالکل آزاد تھا۔ وہ صوفی نش تھا۔ اس فرقے کو اگرچہ کٹر مسلمان بے دین تصور کرتے ہیں لیکن مشرق کے اعلیٰ درجے کے شاعر اور خوش خیال لوگ اسی گروہ کے تھے وہ زائد خشک نہ تھا بلکہ وہ تمام مذاہب کو یکساں قابلِ تعظیم اور ناقابلِ توجہ تصور کرتا تھا۔ ایک مرتبہ رہنیت سنگھ نے اس سے دریافت کیا کہ وہ ہندو مذہب کو زیادہ پسند کرتا ہے یا اسلام کو اس نے جواب دیا کہ "میری حالت اس شخص کی سی ہے جو کسی بڑے دریا میں شناوری کر رہا ہو اور جب ادھر ادھر نظر دوڑاے تو اسے دونوں کنارے بالکل یکساں نظر آئیں" وہ اپنے زمانے میں فصاحت و بلاغت میں مشہور تھا اور جیسی اس کی تقریر تھی ویسی ہی تحریر۔ اس کے مرتبہ تحریرات سلطنتِ ایشیائی مذاق کے لحاظ سے ذوقِ سلیم و خوش تحریری کا نمونہ مانی جاتی ہیں۔ وہ خود مشرقی علوم کے تمام شعبوں میں کامل دستگاہ رکھتا تھا اور علم کا بڑا فیاض حامی اور خدا شناس تھا لاہور میں اس نے اپنے صرفے سے ایک دارالعلوم عربی و فارسی تسلیم کے لئے جاری کیا اور پنجاب کے سابق علماء عربی کی ایک کثیر تعداد اسی درس گاہ سے مستفید ہوئی تھی۔

شاعر کی حیثیت سے عزیز الدین کا پایہ بہت بلند ہے اس کی فارسی نظم جس کا رنگ صوفیانہ ہے اپنی سادگی اور بلند خیالی کے لحاظ سے بہت دل آویز ہے۔ چند قطعات کا ترجمہ صوفی رنگ سے واقف کرنے کی غرض سے درج ذیل کیا جاتا ہے :-

"اگر تم دنیا پر غور کرو تو تم دیکھو گے کہ وہ سایہ کی طرح گریزاں ہے۔
بجا خواہشات سے کیوں اپنی طبیعت مکہ رکرتے ہو وہاں حالیکہ تمہیں ان کے

انجام دہی کی قدرت نہیں۔

خود کو فراموش کر کے سرا انجام خدا پر چھوڑ دو اور صبر کے ساتھ اس پر بھروسہ رکھو۔ تاکہ وہ تم کو اپنی نعمتوں سے مالا مال کر دے اس کی رحمت کے منتظر رہو اور بوجھ اس نے دیا ہے اس پر شکر کرو۔

دنیا کے کمزوریات و مصائب سے کان بند کرو۔ خدا ہی سے دل شاد کرو اور اسی کے رحم کا آسرا رکھو عقلاً مجھ کو بت پرست تصور کریں گے اگر میں خودی کا بے سوچنے سمجھنے مدعی ہوں۔ دانشمند اور صاحبِ ادراک کے نزدیک اپنی ہمتی کا ادعا حماقت ہے۔ گو سہراب زال رتم کو بھی تو نیچا دکھا دیا لیکن آخر کار تیری توانائی نا استوار

ونقش برآب ہے یہ دسواں ہی دسواں ہے کہ تخیل مکڑی کا سا جال اتنے یہ کافی ہے کہ میں آزادی کی ہوا کھاؤں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ہر چیز کا انحصار خدا ہی پر ہے۔
 عزیز الدین کے شریفانہ برتاؤ اور چالپوسی و مخین میں مبالغہ کرنے کا پردہ سیوں پر بہت گہرا اثر پڑتا تھا اور لاہور کے نامہذب و وحشیانہ انداز کے خیال سے اس کی یہ کیفیت اور بھی تعجب خیز تھی۔ بخارا اور دہلی کے مسلمان درباریوں کی اصلی شان کا اس نے ان پڑھ سکھ سردار کے وزیر میں پائے جانے سے تعجب ہوتا تھا۔ بیرن چارلس ہیوگل نے ۱۸۳۵ء میں پنجاب میں سفر کیا تھا اور پنجاب کے الحاق سے قبل جس قدر سفر نامے اس ملک کے متعلق لکھے گئے تھے ان میں سب سے زیادہ دلچسپ اس شخص کا سفر نامہ ہے۔ اس شخص کے دل پر عزیز الدین نے گہرا اثر کیا تھا۔ اس کی نگین بیانی کی اس نے بہت سی مثالیں تحریر کی ہیں۔ فقیر عزیز الدین حسب معمول ہمارا جہ اور اس کے یوروپین مہمان کے مابین متوسط ہوتا تھا۔ بیرن ہیوگل کو بہت کچھ ترغیب دلائی گئی کہ وہ چھ ہزار کی بیش قرار ماہوار ہمارا جہ کی سلک ملازمت میں داخل ہو۔ کیونکہ اس نوجوان سیاح کی قابلیت و کمال نے ہمارا جہ کو متحیر کر دیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ باوجود مبالغہ تحسین جو فارسی زبان کی مروجہ آداب کلام کی چاشنی سے مملو تھا بیرن ہیوگل کے دل میں اس وزیر کی سچ عظمت تھی۔
 ۱۸۴۰ء میں عزیز الدین کو لارڈ ایلن براکے ملاقات کے لئے فیروز پور روانہ کیا گیا جہاں بہت بڑا دربار منعقد ہونے والا تھا۔ گورنر جنرل کے استقبال کے متعلق سکھ وفد کے حاضر نہ ہونے کی وجہ سے جس سودا بی کا خیال کیا گیا تھا اس کا سبب اس نے ایسی قابلیت اور خوش اخلاقی سے پیش کیا کہ گورنر جنرل نے اسے بھرے دربار میں ہر دو سلطنتوں کی دوستی کے محافظ کے لقب سے موسوم کیا اور اپنی جی بی طوائف گھڑی تحفے دی۔ میں نے یہ گھڑی اس کے فرزند سید جمال الدین مینشی کے پاس اکثر دیکھی ہے جو لاہور میں میرا مقیم تھا۔ فقیر عزیز الدین کا دسمبر ۱۸۴۵ء میں عین اس شرکت فاش سے قبل جو سکھوں کو پہلی لڑائی میں نصیب ہوئی انتقال ہوا۔ وہ مرتے دم تک سکھ فوج کے تبلیغ پر بغرض جنگ بھیجے جانے کے مخالف رہا اور اس طور پر گویا اس نے انگریزوں اور لاہور کے دربار کی آخری خدمت گزاری کی گو وہ بے سود رہی۔ اس کے خاندان کے اکثر اراکین سے میری ملاقات ہے لیکن ان سب میں اس کا بھتیجا شمس الدین

اس سے بہت مشابہ ہے۔ اب تو اس کا انتقال ہو چکا ہے لیکن عرصے تک ہم بے تکلف دوست رہے اور میں نے ہندوستان میں کوئی شخص اس سے زیادہ ہندو و سلیقہ شعار اور فارسی زبان کی رنگین بیانی میں اس سے بڑھ کر نہ دیکھا۔ عزیز الدین کے دونوں چھوٹے بھائی امام الدین و نور الدین ہمارا راجہ کے محزرا کہیں تھے گو ان کی وقعت اپنے بڑے بھائی کے مثل نہ تھی خصوصاً نور الدین کی ملک میں عموماً بڑی عزت کی جاتی تھی اور لشعراء کی لڑائی کے بعد جب کہ راجہ لال سنگھ بناوت کے جرم میں معزول کیا گیا تو ہمارا راجہ دیپ سنگھ کے سن بلوغ کو پہنچنے تک جو مجلس انتظام مملکت کے لیے مقرر کی گئی تھی اس کا ایک رکن نور الدین بھی مقرر کیا گیا تھا۔ بڑا بھائی عموماً دربار میں فقیر صاحب کے لقب سے پکارا جاتا تھا اور یہ لقب اس وجہ سے انھیں دیا گیا تھا کہ یہ خاندان فقیری حیثیت قائم رکھنا باعث فخر سمجھتا تھا اور باوجود امارت فقر نش تھا اور فقر و فاقے میں دن کاٹتا تھا۔ کیونکہ یہ تینوں بھائی بہت دولتمند تھے۔ نور الدین کو دربار میں خلیفہ صاحب کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا امام الدین رنجیت سنگھ کے عہد حکومت کے ایک بڑے خطہ میں اور ہمارا راجہ شیر سنگھ کے زمانے تک امرتسر کے قلعے کو بند گڑھ کا حاکم رہا۔

دربار میں ملتان کے دو مسلمان نواب سرفراز خاں اور اس کا چھوٹا بھائی ذوالفقار خاں بہت ممتاز تھے۔ یہ دونوں بھائی سردار مظفر خاں کے فرزند تھے جو رنجیت سنگھ کے شہر ملتان پر حملہ کر کے قلعے میں روزن کرنے پر اس کی مدافعت میں اپنے پانچ بیٹوں اور جسرگہ والوں کے تعداد کثیر کے ساتھ شمشیر برف جان بحق تسلیم ہوا۔ ہمارا راجہ کی فتوحات میں سے کسی فتح کے حصول میں اسے اس درجے مزاحمت و مشکل نہیں پیش آئی جیسی ملتان کی فتح میں۔ جب اس کی حکومت ملتان کے صوبے پر مستحکم طور پر قائم ہو گئی تو اس نے اپنے مفتوح دشمن کی اولاد پر عالی حوصلگی سے نوازش کی۔ وہ انھیں لاہور اپنے ہمراہ لایا اور ان کے لیے وظائف مقرر کیے جن کو سرکار انگریزی نے بھی ان کے ورثاء پر برقرار رکھا۔

دوسرا مسلمان سردار جس پر فتح حاصل کی گئی اور رنجیت سنگھ کے لواحقین میں لاہور میں تھا خدایار خاں نامی ٹوانا کا سردار تھا۔ یہ شخص اپنے چچا زاد بھائیوں کے ساتھ ۵۰ ٹوانہ سواروں کا سرگروہ بنا کر لاہور لایا گیا پنجاب بھر میں ٹوانا سے زیادہ کوئی شہسوار خوبصورت جوان ملنا نامکن ہے۔ ٹوانا ہمیشہ سے اپنی بہادری کے لیے مشہور ہیں اور

اگر یہ عہدہ داروں کی ماتحتی میں انھوں نے کاربائے نمایاں انجام دئے ہیں؛ مہاراجہ کے دربار میں جمعہ ارخوشحال سنگھ بھی ممتاز شخص تھا۔ وہ ضلع میرٹھ کے ایک برہمن دوکاندار کا بیٹا تھا۔ (۱۷) سال کی عمر میں وہ بتلاش معاش لاہور آیا اور دھوکا سنگھ والا فوج میں جو اس وقت مرتب کی جا رہی تھی پانچ روپیہ ماہوار پر ملازم ہو گیا۔ اس کے بعد ہی مہاراجہ کے عرض بیگی سے اس کی دوستی ہو گئی اور وہ مہاراجہ کے محافظ دستہ فوج میں مقرر کیا گیا یہاں اس کی ہوشیاری خوبصورتی اور سپاہیانہ انداز کی وجہ سے مہاراجہ کی توجہ اس پر ہو گئی۔ اس کے خاندان میں یہ روایت مشہور ہے کہ ایک رات کو رنجیت سنگھ بھیس بدل کر باہر گیا۔ جب وہ واپس ہوا تو خوشحال سنگھ نے جو پہرے پر تھا اسے محل میں داخل نہ ہونے دیا اور رات بھر حراست میں رکھا۔ اسکی اس ہوشیاری و مستعدی سے رنجیت سنگھ اس درجہ خوش ہوا کہ اس نے اسے اپنا خاص محافظ مقرر کیا۔ بہر حال جو کچھ ہو اس کا رنجیت سنگھ کے مقربین کے زمرے میں شمار اور روز بروز ترقی کرنا یقینی امر ہے۔ ۱۷۸۱ء میں وہ دیوڑھی والہ باغ عرض بیگی مقرر کیا گیا اور اسے جمعہ ار کا خطاب دیا گیا۔ اس خدمت کی بڑی وقعت تھی۔ عرض بیگی تمام مراسم کی انجام دہی کی نگرانی جلوس کی ترتیب اور دربار کی محافظت کیا کرتا تھا۔ اگرچہ روزانہ دربار میں عام شرکاء و ذی وقت عہدہ دار بلا امتیاز شریک ہو سکتے تھے لیکن مہاراجہ کی خانگی ملاقات اسی کے توسط سے ہوتی تھی گولاقانی تچا ہے کتنا ہی عالی رتبہ کیوں نہ ہو؟

لاہور آنے کے پانچ سال بعد اسے سکھ مذہب میں داخل کیا گیا۔ اس کے بعد سے اس کی جلد جلد قدر افزائی ہونے لگی اور وہ متمول ہو گیا کیونکہ جو اثر اس کا اپنے آقا پر تھا اس کی وجہ سے درباریوں سے اسے رشوت و تحایف بہ کثرت ملتے رہتے تھے۔ وہ متعدد فوجی خدمات پر مامور کیا گیا۔ ۱۷۸۲ء میں، ماتحتی شہزادہ شیر سنگھ وہ کشمیر کا صوبہ دار مقرر کیا گیا جہاں اس کے مظالم نے گرانی کو قحط سے تبدیل کر دیا۔ اس میں کوئی خاص جوہر یا قابلیت نہ تھی اور گواہ تہہ میں مہاراجہ اس کی خوش و ضعی سے متاثر ہونا بیان کیا جاتا ہے لیکن اس کے بعد کی تصویروں سے تو وہ خوبصورت سکھ سرداروں سے بدرجہا بھونڈا بصورت معمولی گنوار معلوم ہوتا ہے۔ دربار میں عام طور پر وہ ہر لحاظ سے گنوار عموماً اس کے اطوار سے ظلم کے آثار نمودار تھے۔ اس کا بھتیجا تاج سنگھ بھی جو اس کے ساتھ لاہور آیا تھا

مقربین میں شامل اور راجہ بنادیا گیا تھا۔ جب سکھوں کی انگریزوں سے پہلی مرتبہ لڑائی ہوئی تو یہ سکھ فوج کا سپہ سالار مقرر کیا گیا تھا لیکن اس پر دغا بازی اور بزدلی کا الزام عائد کیا گیا۔ لیکن سکھ فوج کے طبائع اس قدر متلون اور شکنی اور جن حالات میں اسے فوج کی سپہ سالاری کرنی پڑی اُس میں اس درجے دشواریاں تھیں کہ جن لوگوں نے تیج سنگھ کے واقعات اور حالات کو غور سے دیکھا ہے وہ کمزوری و متلون مزاجی کے سوا اُس کو کسی اور جرم کا مجرم بحال قرار دے سکتے ہیں۔

ہری سنگھ نلوا جنگجو سرداروں میں سب سے زیادہ نام آور تھا اور مہاراجہ کو اس سے بہت گرویدگی تھی۔ شخص بھی رنجیت سنگھ کی طرح گجراتوالہ میں پیدا ہوا تھا۔ وہ سب سے بہادر تھا اور مہاراجہ کے تمام سپہ سالاروں میں سب سے زیادہ ہوشیار بھی تھا اور تمام دشوار جہات میں وہی سپہ سالار بنایا جاتا تھا۔ شہداء میں ملتان کی فتح زیادہ تر اسی کی کارگذاری سے ہوئی۔ اس کے دوسرے سال اس نے ایک دستہ فوج لیکر کشمیر پر حملہ کیا جہاں بعد میں وہ صوبہ دار مامور کیا گیا۔ لیکن اس کی طبیعت انتظام مملکت سے مناسبت نہ رکھتی تھی اور اس وجہ سے لوگ اس سے اس درجہ بگاڑ گئے کہ مہاراجہ کو مجبوراً اسے واپس طلب کر لینا پڑا۔ اس کے بعد وہ پنجاب کی سرحد پر ہزارہ کا اور بعد میں پیشاور کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ پیشاور ہی میں وہ ۱۸۳۷ء میں افغانوں کی جنگ کے عین معرکے میں مارا گیا۔

ہری سنگھ نلوا کے بعد لڑنے والوں میں سردار عطر سنگھ سدھن والیہ بہت نمودار تھا۔ شخص اپنی طاقت اور جرأت کی وجہ سے خالصے کا سورما مانا جاتا تھا۔ وہ خاص پنجاب کے ایک ذی اقتدار خاندان کا رکن تھا جس سے خود مہاراجہ کا تعلق تھا۔ سدھن والیہ گروہ بڑا شورہ پشت تھا عطر سنگھ اس کے بھائی لہنا سنگھ اور اس کے بھتیجے اجیت سنگھ ان سازشوں میں شریک غالب تھے جو رنجیت سنگھ کی موت سے قبل و بعد وقوع پذیر ہوئیں۔ انھوں نے جہوں کے تینوں راجاؤں کے اقتدار کی مخالفت کی اور تینوں جان سے مارے گئے۔

راجہ گلاب سنگھ راجہ دھیان سنگھ اور راجہ سمیت سنگھ ادنیٰ ڈوگر راجپوت خاندان کے افراد تھے لیکن محض اپنی قابلیت اور قوت علی کے زور سے بادشاہت کے

آخر زمانے میں عروج حاصل کیا۔ پنجاب بھائی راجہ دھیان سنگھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی زندگی میں ان سب میں زیادہ ممتاز تھا۔ وہ جمدار خوش حال سنگھ کے بعد دیوڑھی کی خدمت پر مامور کیا گیا اور کچھ عرصے تک وہی درحقیقت مدارالمہامی کی خدمت انجام دیتا رہا کیونکہ رعایا اور مہاراجہ کے مابین وہی واسطہ تھا اور سوائے محکمہ خارجہ اور خزانہ کے جو راجہ دینا ناتھ اور فقیر عزیز الدین سے متعلق تھے دوسرے تمام محکموں پر اسے اقتدار حاصل تھا۔ اس کے بھائی گلاب سنگھ سے عموماً فوجی خدمات متعلق تھیں۔ لیکن مہاراجہ کے انتقال اور اپنے بھائی دھیان سنگھ کے قتل کے بعد وہ کچھ عرصے تک لاہور کے دربار کا سب سے مقتدر شخص ہو گیا تھا۔ شہنشاہ کی پہلی لڑائی کے موقع پر اس نے انگریزوں کی ایسی خدمتیں انجام دیں جن کے لحاظ سے گورنر جنرل نے اُسے صوبہ کشمیر کا خود مختار حاکم مقرر کیا۔ پنجاب کی تاریخ میں غالباً کوئی شخص راجہ دھیان سنگھ اور راجہ گلاب سنگھ سے زیادہ قابلِ تضرع نہیں ہے۔ ان کی اعلیٰ ذہانت اور حقیقی بہادری نے اور بھی زیادہ ان کے وحشیانہ مظالم۔ دغا بازی حرص و جاہ طلبی کے عیوب کو نمایاں کر دیا ہے۔ تیسرا بھائی سچیت سنگھ فوج میں سب سے زیادہ خوش رو اور دربار میں شان دار شخص تھا۔ اس میں اپنے جہانوں کی سی قابلیت نہ تھی اور لاہور کے سیاسی امور میں اُس کی مستقل شرکت نہ تھی۔ راجہ دھیان سنگھ کا بھتیجا راجہ بہر سنگھ ایک ہونہار نوجوان تھا وہ اپنے باپ کی جگہ مدارالمہامی مقرر کیا گیا۔ لیکن اسی کی طرح سکھوں کی پہلی لڑائی سے قبل جو شورش اور فساد برپا ہوا اس میں مارا گیا۔

مہاراجہ کی آخر زندگی میں جن لوگوں نے اقتدار میں ترقی کی ان سب میں راجہ دینا ناتھ سے جڑھ کر کوئی قابلِ ذکر نہیں۔ اسے پنجاب کا ٹیلرانڈ کہنا بالکل بجاد و درست ہے۔ اس کی زندگی اور روش یورپ کے اس زبردست مدبر سلطنت کے بہت مشابہ تھی۔ بڑے بڑے انقلاب اُس کے سامنے گذرے جس میں اس کے احباب دوسرے پرست تلف ہو گئے۔ خاندانوں کو عروج و زوال ہوا لیکن اس کا بال بیکانہ ہوا۔ قتل و خونریزی میں اس کی جان کبھی معرض خطر میں نہ پڑی۔ املاک کی ضبطی اور عدالتی لوٹ مار تمام ریاست میں پھیل گئی تھی لیکن اس کی دولت و اقتدار میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ اس کی فراست اور دور اندیشی ایسی بڑھی ہوئی تھی کہ جب دوسروں کی نظر میں سیاسی مطلع پاک و صاف

نظر آتا تو وہ آنے والے طوفان سے آگاہ ہو کر تنبہ ہو جاتا اور اس جماعت سے کنارہ کشی کر لیتا یا اس دوست کو ترک کر دیتا جو معرض زوال میں آنے والا ہوتا۔ ایسا ہمارا اشخاص اکشر انقلابات سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔ اس کی بیوفائی اس کی کامیابی کا ذریعہ ہوتی۔ وہ محب وطن ضرور تھا لیکن اس کی جب وطن حب ذات کی تابع تھی۔ وہ انگریزوں سے سخت متنفر تھا کیونکہ وہ اس کی ذات اور اس کے ملک دونوں سے زیادہ طاقتور تھے لیکن اس کے اغراض نے ان لوگوں کی خدمت گزاری پر اسے مجبور کیا جیسے سمون پہلوان فلسطینوں کی خدمت پر مجبور تھا۔ وفاداری کے متعلق اس کا خاص خیال تھا۔ وہ اپنے دوست کا اس وقت تک شریک رہتا جب تک کہ خود اس کو کوئی گزند پہنچے۔ وہ اس سے صرف اپنے اقتدار و دولت کے زوال کے اندیشے کی وجہ سے قطع تعلق کرتا نہ کہ کسی دُشمن سے کیونکہ وہ فطرۃً بہادر تھا اور اُس میں اعلیٰ درجے کی اخلاقی جرأت تھی گو وہ بلا لحاظ نتائج حق بات کے لئے ہرگز آمادہ نہ ہوتا تھا۔ اس کی مقامی معلومات وسیع تھیں اور اسی طرح اس میں کام کرنے کی بھی بڑی صلاحیت تھی لیکن اس کی یہ خواہش کہ تمام اقتدار اس کے ہاتھ میں رہے اجرائی کار میں مغل ہوتی تھی۔ وہ بڑا دنیا دار تھا آداب صحبت سے آگاہ اور مردم شناس۔ گو وہ عالم نہ تھا لیکن اچھا تعلیم یافتہ تھا۔ انگریزوں کے ساتھ گفتگو کرنے وقت وہ جرات اور بہ ظاہر بیباکی سے کلام کرتا تھا اور چونکہ ایک ایشیائی شخص کے لئے یہ اوصاف غیر معمولی تھے اس لئے خوشناما معلوم ہوتے تھے۔

سکھتہ میں راجہ دینا ناتھ وزیر خزانہ مقرر کیا گیا جس کے لئے وہ بہت ہی موزوں تھا۔ لیکن مہاراجہ کو ایک عرصے سے اس پر اعتماد تھا اور تمام اہم معاملات میں وہ اسی سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ اپنے آقا کے مرنے کے بعد اسے سرداروں میں اور فوج پر بڑا اقتدار حاصل رہا اور سرکار انگریزی کے لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد وہ مجلس انتظام ریاست کا رکن مقرر کیا گیا جہاں وہ بہت لایق اور کارآمد ثابت ہوا۔ اگرچہ خزانے کے افسر اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے اسے اپنے آپ کو سرکاری رقوم سے مشمول ہو جانے کا بہت کچھ موقع تھا اور گمان غالب یہ ہے کہ اس نے اس موقع سے فائدہ بھی ضرور اٹھایا۔ لیکن اوروں کے مقابلے میں اس نے زیادہ بے غرضی سے کام کیا اور انگریزی سفیر مقیم لاہور کی بہت مدد کی۔ اس کی حساب فہمی اور کاروبار کی

انجام دی کی عادت کی وجہ سے دربار کے حساب سلجھ گئے جن کا اس کے بغیر پہچانا ناممکن تھا۔ اور پنجاب کے الحاق کے بعد دینا ناٹھ سے محاصل و جاگیرات کے متعلق اس کی مدد بھی قابل قدر تھی جیسے اس کے قبل تھی۔ سکھوں کے شہداء میں بغاوت کرنے کے موقع پر بعضوں کا خیال یہ ہوا کہ دینا ناٹھ پونفیدہ طور پر دغا باز ہے اور خود اس نے یہ شورش برپا کرائی ہے اور یہ کہ اگر وہ دو تہہ نہ ہوتا اور اس کے پاس مکانات و باغات کے علاوہ لاکھوں روپے نقد لاہور میں نہ ہوتے جن کی ضبطی بہت آسان تھی تو وہ ہلاتر دو باغیوں میں شامل ہو جاتا۔ لیکن یہ سب قصے شاید اس کے دشمنوں نے تصنیف کئے ہیں لیکن امر یقینی یہ ہے کہ جب اسے لاہور واپس طلب کیا گیا تو اس نے سرکار انگریزی کے حکام کے حسب خواہش بڑی سرگرمی اور مستعدی سے باغیوں کی جا پادیں ضبط کرنے اور ان کے منصوبوں کے تباہ کرنے میں بہت کچھ مدد دی۔

دربار کے ہمیشہ حاضر باش لیکن عموماً خاموش درباریوں کے ضمن میں سکھ پوجاریوں بھائی رام سنگھ بھائی گوہر سنگھ اور بھائی گرکھ سنگھ کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ بمجملہ پہلے دو ایک مشہور سکھ پوجاری اور گرو کے پوتے تھے جو لاہور میں رہتا تھا اور اٹھارہویں صدی میں ساہیالے دروازہ تک سکھ اس کی عام طور پر غلطی و وقعت کرتے تھے۔ یہ مہاراجہ کے شہداء میں لاہور فتح کرنے کے دو سال بعد تقریباً سو برس کی عمر میں فوت ہوا۔ رنجیت سنگھ اس بزرگ کی بہت عزت کرتا تھا اور اس کے پوتوں کو اس نے جاگیریں عطا کیں۔ ان میں سے رام سنگھ بہت با اثر شخص تھا اور جنگ کے معرکوں میں ہمیشہ اس کا خیمہ رنجیت سنگھ کے خیمہ کے پاس نصب کیا جاتا تھا۔ مہاراجہ ہمیشہ ایک قاصد کو انھیں عزت کے ساتھ دربار میں لانے کے لئے روانہ کیا کرتا تھا اور ان کی بڑی آدبھگت کی جاتی تھی۔ بھائی گرکھ سنگھ سنت سنگھ کا لڑکا تھا جو امرتسر کے دربار صاحب کا متولی تھا وہ پوجاری بھی تھا اور سپاہی بھی اور اکثر فوجی خدمتیں بڑی قابلیت سے انجام دی تھیں۔ جب اس نے دنیاوی کاروبار کو ترک کر کے سکھوں کی مذہبی کتاب کا مطالعہ اور تشریح شروع کی تو اپنے بیٹے گرکھ سنگھ کو دربار میں روانہ کر دیا یہ فوجوان بھی اپنے باپ کی طرح ہر دل عزیز ہو گیا گوا سے کبھی اپنے حریف اور دشمن بھائی رام سنگھ کا ساتھ اختیار نصیب نہیں ہوا۔

لاہور کے دوسرے ممتاز لوگوں میں مصر لیا رام کروڑ گیری کا افسر اعلیٰ تھا۔ اس کا لڑکا آخر میں راجہ صاحب دیال کے لقب سے مخاطب ہوا۔ اٹاری والی افاندان کے سردار چتر سنگھ۔ شیر سنگھ اور شام سنگھ تھے۔ ان میں سے پہلے دو شخصوں کی سکھ بغاوت کے خاص سرغنہ تھے۔ جیٹھ خاندان کے سرداروں میں سے دیسا سنگھ اور اس کا بیٹا لہنا سنگھ سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ لہنا سنگھ حسام الدولہ یعنی "تغریاست" کا لقب دیا گیا یہ بڑا قابل شخص تھا۔ وہ کلوں کے کام کا ماہر بلکہ موہد تھا۔ اس نے سکھ تو بچانہ کی بہت کچھ اصلاح کی اور اس کی بنائی ہوئی چن جو بہدورت توپیں علی وال اور اور مقامات پر بھیجی گئیں۔ منجملہ اور اشیا کے اس نے ایک گھڑی ایسی بنائی جس سے گھنٹہ نایخ اور چاند کے نوکلات ظاہر ہوتے تھے۔ وہ علم ہیئت اور ریاضی کا بہت شوق رکھتا تھا اور کئی زبانوں میں کامل دستگاہ تھی۔ حاکم ہو کے وہ بہت ہرزہ خیز تھا۔ وہ کبھی غریب پر سختی نہ کیا تھا۔ اس کی تشخیص لگان ہمیشہ معتدل اور اس کے فیصلے منصفانہ ہوتے تھے۔ بد حیثیت مدبر ہی ایک شخص تھا جسے لاہور کے دربار میں ایماندار کہا جاسکتا ہے جل و رشوت کا بازار گرم تھا لیکن لہنا سنگھ کے ہاتھ کبھی اس لوٹ سے آلودہ نہ ہوئے۔ طماع۔ بدنیت اور سازشی لوگوں کے زرغے میں وہ گھرا ہوا تھا کبھی اس نے اپنی ایمانداری پر حرف نہ آنے دیا۔ اگر لہنا سنگھ کی سی وقعت اور انتظامی قابلیت کا کوئی شخص ۱۸۴۵ء میں پنجاب میں مقدم ہوتا تو ملک پر جو ہلائیں نازل ہوئیں وہ نہ آتیں۔ لیکن وہ حقیقی محب وطن نہ تھا۔ وہ نہ سمجھا کہ مدبرین سلطنت بلکہ ہر ایماندار شخص کا مذہب یہ ہونا چاہئے کہ خطرے کے وقت اپنے ملک کا ساتھ دے۔ مصائب میں اس کا شریک رہے اور اگر ضرورت ہو تو اس کے زوال کے ساتھ خود ہی مٹ جائے۔

باب ہفتم

مہاراجہ کی فوج و انتظام مملکت

مہاراجہ کی فوجی طباعی کا اظہار فوج کی سپہ سالاری میں نہیں ہوتا تھا کیونکہ اس بارے میں اس کے بہت سے عہدہ دار اور دوسرے سردار اس پر سبقت لے گئے تھے۔ اس کی اس قابلیت کا اظہار اس امر سے ہوتا تھا کہ اس نے کس قدر طاقت و تربیت یافتہ اور ساز و سامان سے آراستہ فوج بے قاعدہ سرکش اور خود سرکھوں کی بھرتی سے قائم کی۔ درآئیکہ یہ لوگ جب کبھی انھیں لوٹ مار کے زیادہ موافقے دستیاب ہونے کی توقع ہوتی تو ایک سردار کا ساتھ چھوڑ کر دوسرے کے ساتھ جا ملتے اور اپنی سہولت و میلان طبع کے موافق سرداروں میں تغیر و تبدل کیا کرتے تھے۔

جس وقت اس کا داداچرت سنگھ اور اس کا باپ مہان سنگھ سرکار کیا ریاست پر حکمران تھے اس وقت سکھ جماعت میں طوائف الملوک پھیلی ہوئی تھی۔ ایسے خود سری کے زمانے میں جب کہ ہر شخص جو کچھ وہ چھین چھپٹ سکتا اس پر قابض ہو جاتا اور اس کے برقرار رکھنے کے لئے بے سمر رافقت ہوتا تھا نئے نئے سردار و پیشوا کم و بیش اقتدار کے ساتھ پیدا ہوتے رہتے تھے لیکن ایسی پیشوائی سے لوگوں کے نگاہوں میں اس شخص کی کوئی حقیقی وقعت و عظمت نہ ہوتی تھی۔ سکھوں کی مذہبی حکومت زمانہ حال کے یورپ و امریکہ کی جمہوریت سے حقیقتاً کہیں زیادہ مساوات و اخوت پر مبنی تھی۔

سکھوں کی تنظیم و لڑائی کے طریقے کا ذکر اس کے پیشہ کے باب میں کیا گیا ہے۔ یہ لوگ بالخصوص سوار تھے نہ کہ پیادہ۔ پیادہ فوج سوار سے کم رتبہ سمجھی جاتی تھی اور جنگ کے موقع پر یا تو قلعوں کی نگہداشت اور غورتوں کی حفاظت کے لئے پیادے پیچھے چھوڑ دیے جاتے تھے یا لڑنے والوں کے ہمراہ اس غرض سے رکھے جاتے تھے کہ جب موقع ملے تو اپنے لئے خواہ چاکر یا خرید کر کھوڑا مہیا کریں اور اس طرح اپنا مرتبہ تبدیل کر کے ان میں شامل ہو جائیں۔

مہاراجہ نجیت سنگھ نے اپنے ابتدائی زمانے میں اپنی خداداد دانشمندی سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ سکھوں کا طریقہ جنگ ان لوگوں کی طبیعت کے مناسب نہیں ہے اور جب تک اس میں اصلاح نہ کی جائے اس وقت تک ایسی باضابطہ فوج پر جیسی کہ انگریزی فوج ہے کوئی مستحکم فتح کی توقع نہیں ہو سکتی جس کی قواعد و فوجی تربیت کو اس نے بغور و فکر دریافت کیا تھا یا افغانوں کی فوج کے مقابلے میں جو احمد شاہ کے زمانے میں معقول طور پر تربیت یافتہ ہو گئی تھی۔ جو کھلے میدانوں میں خونخوار دشمن تھے اور پہاڑیوں میں تو ان پر فتح پانا قطعاً ناممکن تھا۔ اس نے جب انگریزی فوجی تنظیم کی خوبی سے جس کے مقابلے میں ہندوستان کی تمام جنگجو قوتیں طاقت آزمائی کر کے پست ہو چکی تھیں اچھی طرح واقفیت حاصل کر لی اور اس راز سے آگاہ ہو گیا تو اس نے اس امر کا مصمم ارادہ کر لیا کہ اسی طرز پر فوج کی تربیت کرے اور اسی کے ساتھ ایسا ہی مستحکم ارادہ اس طاقت سے صلح رکھنے کا کیا جس کی وہ وقوت کرنے لگا تھا۔ ان ہی خیالات کی بنا پر مہاراجہ نے خالصہ فوج کی تنظیم کو ایک سرے سے بدل دیا۔ اب سوار فوج کی اس درجہ اہمیت باقی نہیں رہی اور پیادہ فوج زیادہ پسند کی جانے لگی اس تبدیلی میں فرانسیسی و اطالوی عہدہ داروں کے تقرر سے زیادہ ہولت ہو گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سے عہدہ دار استعار ملنے میں مہاراجہ کو نا کامیابی ہوئی تو اس نے ان عہدہ داروں کو مامور کیا۔ ان پر دیسی افسروں نے ان طریقوں کا فوج میں رواج دینا شروع کیا جو یورپ میں عام طور سے رائج تھے اور جہاں پیادہ فوج سوار فوج کے مقابلے میں عام طور پر زیادہ کار آمد تصور کی جاتی تھی۔ ان میں سے بعض اشخاص بہت قابل تھے اور لاہور کی فوج کی اصلاح کے بارے میں انہوں نے جو کچھ وعدے کئے تھے ان کے ایفاء کی ان میں پوری صلاحیت تھی۔ ان کے زیر تربیت پیادہ فوج نہایت مہیب، منظم باقاعدہ و مستعد بن گئی گو ان کی فوجی نقل و حرکت میں پھرتی نہ تھی۔ ان میں صبر و برداشت کا مادہ بہت تھا اور بسا اوقات فوج کی فوج کئی کئی روز تک ایک ایک دن میں ۳۰-۳۰ میل سفر کرتی تھی۔

مہاراجہ کے زمانے میں فوجی بھرتی خود اختیار ہی تھی لیکن باوجود اس کے نئے لوگوں کی دستیابی دشوار نہ تھی کیونکہ عام طور پر اس خدمت کو لوگ پسند کرتے تھے۔ سوار فوج کی تربیت اس وقت ہی تقریباً ویسی ہی تھی جیسے کہ خالصہ کے زمانے میں۔

جب کہ فوج کے دل بادل افغانوں کی فوج کے کناروں پر منڈلاتے رہتے اور بانسابلہ فوج پر حملہ کرنے سے خائف ہو کر صرف بدرتہ پر حملہ کر کے دشمن کی خبر رسانی کے سلسلے کو معرض خطر میں ڈال دیتے۔ اس میں شک نہیں کہ ملکہ مسلح سواروں کے اصلی فرائض میں یہ بات داخل تھی لیکن سکھوں کی سوار فوج کے گھوڑے عموماً ناقص اور اسلحہ ناکافی ہوتے تھے اور عام طور پر جب ان پر حملہ ہوتا تو بجائے اظہار مردانگی وہ بھاگنے میں زیادہ مشہور تھے۔ سیادگی کی حالت میں سکھ سپاہی نہایت جبری و مستعد ثابت ہوا ہے۔ اگرچہ انگریزی فوج میں بعض نادر دوسے سکھ سواروں کے ہیں جو دنیا کے دوسرے سوار دستوں کے ہم پلہ ہیں لیکن افغان و ہندوستانی جو پیادہ فوج میں ان سے گھٹے ہوئے ہیں سواروں کی حیثیت سے ان پر فوقیت رکھتے ہیں۔ ہمارا جہ کے زمانے میں پیادہ فوج میں ملک کے چیدہ جوان تھے اور اس میں صرف خوش رو و مضبوط لوگ منتخب کئے جاتے تھے اس کے برخلاف سوار بے قاعدہ فوج تھی جو اس کے سرداروں کے لواحقین تھے اور بہادری یا طاقت کا کوئی لحاظ ان کے بھرتی کرتے وقت نہیں کیا جاتا تھا۔ گھوڑے کم قد کے لاغر۔ دو غلے اور ساز و سامان بھدا و بقطع ہوتا تھا۔ آج کل کی سکھ ریاستوں میں فوج میں بھی جو سب میری و کچھی ہوئی ہیں اور ان میں سے ایک کو خاص طور پر میں نے ہی مرتب کیا ہے وہی طریقہ جاری ہے۔ پیادہ فوج قد و قامت اور ڈیل ڈول میں سکھوں کی انگریزی فوج کی سی تھی لیکن سوار فوج ایسی بڑھی خفیف و ظیفہ خواہوں کا اسپتال ہو گئی ہے جو گھوڑا کی پیٹھ پر تو بیٹھ سکتے ہیں لیکن نہ تو وہ حملہ کر سکتے اور نہ کوئی جسمانی طاقت کا کام انجام دے سکتے ہیں۔ میں نے اس سے قبل اکالیوں کا ذکر کیا ہے کہ وہ خالصہ کے زمانے میں پیادہ فوج کی حیثیت سے سب سے زیادہ باوقت سمجھے جاتے تھے ہمارا جہ ان لوگوں کے بارے میں زیادہ مداخلت کرنے سے ڈرتا تھا کیونکہ اگرچہ ان کی حالت مخمور و خشیوں۔ سے کچھ ہی بہتر تھی لیکن سکھ ان لوگوں کو ایک حد تک بزرگ مانتے تھے اور جب کبھی ایسے کام کے سرانجام کی ضرورت پڑتی جس کی انجام دہی سے باقاعدہ فوج کے سپاہی و عہدہ دار انکار کرتے تو یہی لوگ کام آتے تھے۔ ان ہی لوگوں نے ملکاف کے مسلمان محافظ دستے پر حملہ کر

۱۰ سفر کی تربیت یافتہ محافظ دستہ فوج نے جس متعدی سے اکالی ہنگامہ اراؤں کو مار بھگایا اس سے رجحیت سنگھ پر

دیوانہ وار حملہ کر کے مہاراجہ کو انگریزوں سے تقریباً لڑا دیا۔ ان کی بے خوف جرات نے بہت سی متزلزل لڑائیوں کو فتح سے مبدل کر دیا۔ یہ اپنی روش اور حملہ آوری کے طریق میں افغانستان و سوڈان کے غازیوں کے مشابہ تھے جن کے ہیبت ناک و سخت حملے سوائے باقاعدہ تربیت یافتہ اور تجربہ کار فوج کے، دوسروں کے چھکے چھڑا دیتے ہیں۔ لیکن سکھوں کی نعلانی فوج کی جرات، بجائے اس جوش مذہبی کے جو اسلامیوں کے دل میں بے غشیات کی وجہ سے ہے۔ مہاراجہ کے زمانے میں ان کی ضرر رسانی اور دھماک بہت بڑھی ہوئی تھی اور وہ ہمیشہ اس کے لئے خطرے کے باعث ہوتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے کئی بار اس کی جان لینے کی بیوی کوشش کی تو ان کی گستاخانہ لاف زنی اور یورپین لوگوں سے متفر کرنے انھیں انگریزوں کے قبضے و الحاق کے ابتدائی زمانے میں اس درجے کمزور بنا رکھا تھا کہ امرتسر کے دربار صاحب کے مندر میں جو اکالیوں کا صدر مقام تھا انگریزوں کا جانا خالی از خطہ نہ تھا۔ مہاراجہ یا تو بالکل غیر متعصب تھا اور یا کم از کم لاپرواہ تھا۔ اور وہ یہ چاہتا تھا کہ اس کی مسلمان رعایا بلا مزاحمت مراسم مذہبی ادا کرنے کے مجاز ہوں۔ لیکن اس کو مجبور ہونا پڑا کہ اونچی آواز سے اذان کی مانعت کر دے کیونکہ اس کی آواز سے اکالی برافروشتہ ہوتے تھے۔ مہاراجہ نے ان مذہبی دیوانوں کے ایک باقاعدہ گروہ بنانے کی کوشش کی اور اس لئے اس نے ایک فوج قائم کی جس میں ۳۰۰۰ ہزار بے قاعدہ سوار تھے لیکن اس کا بہت کم اثر ہوا۔ وہ ہمیشہ حملہ کرتے وقت گھوڑوں پر سے اتر بیٹے اور دو زخمی تلوار استعمال کرتے تھے جو انھیں بہت عزیز تھی۔ لوہے کے چکر جو ہمیشہ ان کی پگڑیوں میں لگے رہتے تھے جن کا قطر ۶ سے ۱۱ انچ تک ہوتا تھا اور ان کے کنارے دھاردار ہوتے تھے ایسے خطرناک نہ تھے جیسے کہ وہ لوگ اونکو تصور کرتے تھے۔ اور اصل یہ ہے کہ یہ دوست دشمن سب کے لئے یکساں خطرناک تھے جبکہ بھی کوئی ایسا اکالی نہیں ملا جو ان چکروں کو اچھی یا تھنی طور پر استعمال کر سکتا ہو۔ میں نے اکثر کامیابی کے ساتھ انھیں انکے خلاف استعمال کیا ہے۔ ان کی زورساٹھ (۶۰) سے لے کر (۱۰۰) گز تک ہوتی ہے جو پردیسوں میں سے جو مہاراجہ کی ملاقات کے سلسلے میں داخل ہوئے جنرل ونٹورا۔

بقیہ مضامین صفحہ گذشتہ بڑا اثر پڑا اس کی وجہ سے نہ صرف اس کا رجحان صلح کرنے کے لئے ہوا بلکہ اس نے مستقبل ارادہ کر لیا کہ اپنی فوج کو بھی اسی طرح ترتیب دے۔

سب سے زیادہ باوقفت تھا۔ وہ اطالیہ کا مسرز و معروف شخص تھا۔ اس نے اپین و اٹلی کی افواج میں نیپولین کی ماتحتی میں خدمات انجام دی تھیں اور صلح کے بعد جب اس نے دیکھا کہ وہاں اس قسم کے کاموں کی قدر نہیں رہی تو وہ قسمت آزمائی کرنے کے لئے مکمل کھڑا ہوا۔ دنیا کے جس قطعہ ملک میں اسے موقع ملا وہاں جا پہنچا۔ ایسی طرز و حیثیت کا ایک دوسرا شخص جنرل الرڈ تھا۔ یہ بھی نیپولین کا ایک عہدہ دار تھا جو اپنی قابلیت و بہادری کے جوہر سے اکثر ہمت میں ممتاز رہا تھا۔ ان لوگوں نے پہلے تو اپنی قسمت آزمائی مصر و ایران میں کی لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ شاہ عباس کے یہاں جو بادشاہ وقت تھا ان کی رسائی نامکن ہے تو وہ ہرات و قندھار کے راستے سے ہندوستان چلے آئے۔ یہاں مہاراجہ نے بہت پس و پیش اور عرصے تک ان کے اوصاف کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد انھیں مامور کیا۔ دونوں نے رجحیت سنگھ کی خدمت نہایت وفاداری سے اور عرصے تک انجام دی۔ الرڈ کو سواروں کی فوج بھرتی کرنے کی اجازت دی گئی اور وینٹورا کو فوج خاص کی کمان سپرد کی گئی۔ یہ حصہ فوج تربیت و ساز و سامان کے لحاظ سے تمام سکھ فوج میں اول درجے کا شمار ہوتا تھا اس کی اصلی تعداد کمپادے اور ۲ سوار دستے تھے۔ اور اگرچہ مہاراجہ نے بعد میں اس میں اضافہ کر کے ۵ پیادے اور ۳ سوار دستے قائم کیے لیکن وینٹورا کی درخواست پر اسے پھر اگلی تعداد پر قائم کر دیا۔ جنرل وینٹورا نے اس فوج کے ہمراہ بہت سے ہمت میں کارہائے نمایاں انجام دیئے علی الخصوص پہاڑیوں کے گرد اور پیشاور کے اطراف میں مہاراجہ ہمیشہ اس کو معتبر سمجھتا اور اس کی عزت کرتا تھا۔ اسنے اسے لاہور کا قاضی یا صوبہ دار مقرر کیا جس کی وجہ سے دربار میں اس کا درجہ تیسرا شمار کیا جانے لگا۔ کرنل کورٹ جو فرانسیسی تھا اور جس نے پیرس کے اکولی پالٹیکنیک میں تعلیم پائی تھی گو رکھا فوج کے دو دستوں پر برسر کمان تھا۔ کرنل گارڈنر آئر لینڈ کا باشندہ تھا ان کی تعلیم زیادہ ہوئی تھی اور نہ طور طریقہ بخشت تھا لیکن خاصی قابلیت رکھتا تھا۔ یہ شخص توپ خانے پر مامور کیا گیا۔ کرنل وان کوٹیلینڈ بھی ایک فوجی

لے کرنل گارڈنر کو مرے ہوئے عرصہ ہوا۔ جب میں اس سے ملا تو وہ مہاراجہ کشمیر کا وظیفہ خوار تھا۔ اور ہمیشہ مخمور رہتا تھا۔ اس نے مجھے اپنا مسودہ پڑھنے کے لئے دیا جس میں مہاراجہ کے آخر عمر کے حالات اور اس کے مرنے کے بعد کے واقعات تحریر تھے۔ یہ دلچسپ تحریر جو مسٹر فرڈرک کوبرس ہی تونی کے توفیق سے لکھی تھی تلف ہو گئی۔ تاہم یہی لحاظ سے اس کا تلف ہونا نقصانِ عظیم تصور کیا جاتا ہے۔

عہدہ دار تھا۔ فیخص مخلوط النسل تھیں۔ سکھوں کی حکومت کے زوال کے بعد فیخص سرکار انگریزی کے ملکی شعبہ ملازمت میں داخل ہوا۔ اور غدر کے زمانے میں اس نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ جنرل ایوٹ ایبائل نیپلس کا باشندہ تھا۔ ایران میں ملازمت کرنے کے بعد وہ وینٹورا کے آنے کے چند سال بعد لاہور آیا۔ یہ عام طور پر انتظامی خدمات پر مامور کیا جاتا رہا سب سے پہلے راوی و پنجاب کے ماہن کے قطعہ ملک راجپوت آب پر مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد کئی سال تک پنجاب کے شورش خیز قطعہ ضلع پیشاور پر جہاں اس کے سخت و ہشتناک طور و طریقوں نے اس وحشی قطعہ میں رہ کر ایسا امن قائم کر دیا تھا جو اس ملک کی تاریخ میں پہلا سوتہ تھا۔ خیر کے گرد و اطراف میں متمرّد جروگوں میں اب تک اس کے نام سے لوگ دہشت کرتے ہیں۔ اس نے ان چوروں و قاتلوں کی تعداد کو کثیر کو شہر کے فہیل کے گرد و سولیاں دی تھیں۔ اسکا سزا دی کا طریقہ نہایت سخت تھا اور اگرچہ انگریزوں کا طریقہ اس ہیبتناک اطالوی شخص کے مقابلے میں بہت نرم ہے لیکن پھر بھی جن لوگوں کو شمالی مغربی سرحد پر نظم و نسق قائم رکھنا پڑا ہے انھیں تعین و سخت گیری سے کام لینا پڑتا ہے۔ ہائی کورٹ اور بیرونی ججوں کے ذریعے سے آہستہ و طول طویل کارروائی کرنا ایسے مواقع پر حاکمیت ہے جہاں مجرم کا فوراً تعاقب کر کے اسے عین مصروفیت کی حالت میں گرفتار کر لیا جائے قبل اس کے کہ وہ پہاڑیوں میں پہنچ کر محفوظ ہو جائے۔ ایسی حالت میں سرسری اقرار جرم کے بعد کسی قریب کے درخت پر اسے لٹکا دینا مناسب ہے۔

برادریوں نے جو ہمارا جہ کی ملازمت میں داخل تھے خصوصاً جنرل وینٹورا جو فوج خاص کی کمان پر مامور کیا گیا تھا اور کورٹ جو اس فوج کی کمان پر مقرر کیا گیا تھا جو فرانسیسی فوج کے نام سے موسوم تھی رنجیت سنگھ کے فوج کی تربیت اور قواعد میں بہت کچھ ترقی دی۔ یہ لوگ فوجی مہات کے موقعوں پر افواج کے سپہ سالار مقرر نہیں کیئے جاتے تھے کیونکہ یہ خدمت برائے نام شہزادوں یعنی کھڑک سنگھ۔ شیر سنگھ یا دوسرے بڑے بڑے سرداروں کے تفویض کی جاتی تھی۔ ہمارا جہ کے تمام اعلیٰ فوجی افسروں میں دیوان کھم چند سب سے اچھا تھا۔ فیخص ذات کا کھتری تھا۔ سنہ ۱۸۱۷ء سے ۱۸۱۸ء تک جب کہ اس کا انتقال ہوا تاں مکہ فوج کا درحقیقت یہی سپہ سالار اور ہمارا جہ کے تمام فتوحات میں اُس کا شریک تھا۔ اس کا پوتا رام دیال بھی جو سنہ ۱۸۱۷ء میں بھرا میں مارا گیا بہت ہو شیار فوجی افسر تھا۔ اگر وہ جیتا رہتا تو

ممکن ہے کہ بڑا نام پیدا کرتا۔ سردیوان چند نے جو ہندوؤں کی تجارت پیشہ ذات کا تھا اور اس وجہ سے سنگھ اس سے نفرت کرتے تھے ^{۱۸۳۱ء} میں ملتان فتح کیا۔ اس کے دوسرے سال اس کی سرکردگی میں کشمیر پر فوج روانہ کی گئی جسے کامیابی نصیب ہوئی۔ یکے سر داروں میں جو لوگ زیادہ ممتاز رہے وہ سردار فتح سنگھ کلیان والہ۔ سردار نہال سنگھ اٹاری والہ جس نے ^{۱۸۳۱ء} سے ^{۱۸۳۲ء} تک چار ارجہ کے تمام جہات میں کاروائی نایاں انجام دیئے سردار فتح سنگھ اہلو والیہ جو ہمارا بنگال کپور تھلہ کے اجداد میں سے تھا۔ سردار بدھ سنگھ مدھن والیہ اور اس کا بھائی عطر سنگھ تھے۔ عطر سنگھ سردار ہری سنگھ تلوا کے ^{۱۸۳۲ء} میں حیدر میں انتقال کرنے کے بعد خالصے کا سورا مانا جاتا تھا۔ ہری سنگھ بڑا جری و بہادر سردار تھا۔ فوج والے اس سے بے انتہا الفت کرتے تھے گو مخالف کے لشکر کی تعداد کچھ ہی کیوں نہ ہو وہ ہمیشہ حملہ کرنے اور فتح حاصل کرنے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ اس کے بیٹے جو اب سنگھ میں جو میرا بڑا دوست تھا باپ کے تمام اوصاف موجود تھے۔ اس شخص نے بے قاعدہ سواروں کے دستے کے ساتھ بڑی عمدگی سے چلیان والہ میں انگریزوں پر حملہ کیا جس کے باعث سے فتح آفت و مصیبت سے تقریباً مبدل ہو گئی۔ میں ہمارا جہ کے اور بہت سے مشہور فوجی عہدہ داروں کے نام بیان کر سکتا ہوں جو اب تک پنجاب میں زبان زد خاص و عام ہیں لیکن انگریز ناظرین کو اس سے دلچسپی نہ ہوگی؛

رنجیت سنگھ اور اس کے جانشینوں کے زمانے کے فوج کی ترکیب کے بارے میں پوری واقفیت تنخواہوں کی برآورد اور قبض الوصول کے نقشوں سے ملتی ہے جو ^{۱۸۳۷ء} میں پنجاب پر قبضہ کرنے کے بعد لاہور کے دفاتر سے دستیاب ہوئی۔ فوج خاص کی ترکیب جو جنرل وینٹورا کے زیر نگرانی تھی مثلاً بیان کی جاتی ہے۔ جنرل وینٹورا نے اس فتنہ و فساد سے تنگ آ کر جس میں یو مافیا مارتی ہو رہی تھی اور آنے والی تباہی کے اندیشے سے جس کا پیش آنا لازمی تھا ^{۱۸۳۷ء} میں استعفا دیدیا۔ ہمارا جہ کے مرنے کے بعد اس وقت تک اس نے استعفا نہیں دیا جب تک اسے عملایہ ثابت نہ ہو گیا کہ ہمارا جہ کے بعد سلک ملازمت میں رہنا اندیشہ ناک ہے۔ کیونکہ جنرل کورٹ کی فوج کی تین پلٹنوں نے اس پر اور خود جنرل کورٹ پر حملہ کیا اور وینٹورا کو مجبوراً اپنی اور اپنے دست کی حفاظت کے لئے اپنے توپخانے سے کام لینا پڑا؛

فوج خاص کی ترکیب ۱۸۴۵ء میں جنگ شیلج سے قبل حسب ذیل تھی :-

فوج باقاعدہ پیادہ ————— ۳۱۷۶

فوج باقاعدہ سوار ————— ۱۶۶۷

توپخانہ مع ۳۴ ضرب توپ ————— ۸۵۵

۵۶۹۸ جملہ

پیادہ فوج کے خاص پلٹن میں (۸۲۰) سپاہی تھے۔ گورکھا پلٹن میں (۷۰۷) سپاہی تھے۔ دیوا سنگھ کی پلٹن میں ۸۳۹ سپاہی تھے اور شام سوتا پلٹن میں ۸۱۰ سپاہی تھے۔ یہ سب پیادہ سپاہ میں داخل تھے۔

سوار فوج میں گرائٹیل رجمنٹ جس میں ۷۳۰ نفر تھے۔ سہ نیم سوار وراگوں رجمنٹ جن کی تعداد ۷۵۰ تھی اور اسی میں شاہی محافظ دستہ شامل تھا جس میں ۸۷ آدمی تھے۔ توپخانہ الہی بخش کے پائے نام تھا جو اسی نام کے ایک مسلمان فوجی افسر کے زیرِ کمان تھا۔ یہ شخص سکھ فوج میں بہترین افسر توپ خانہ تھا۔ تمام فوج کی تنخواہ ۹۶۰۶۷ روپے ماہانہ (یہ رقم اس وقت ۱۰ ہزار پاؤنڈ کے قریب تھی) تھی۔

۱۸۳۹ء میں مہاراجہ کی وفات ہوئی۔ اس کے انتقال کے بعد فوج کی ترکیب میں بڑا تغیر واقع ہوا۔ اس کے قوت و اقتدار نے بغاوت و شکوہ شکایت کو دبلے رکھا تھا گو خود اسے ایک مرتبہ گوبند گڑھ کے قلعے میں گورکھا پلٹن کے غصے سے پناہ دینی پڑی جو بقایا تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے بگڑ گئی تھی۔ اس کے جانشین اپنی جان کے جانے و حکومت کے ضائع ہونے کے خوف سے فوج کی تعداد و تنخواہ میں اضافہ کرنے پر مجبور ہوئے یہاں تک کہ یہ فوج ریاست کے لیے بارگراں ہو گئی کہ اس کو برداشت کرنا مشکل تھا اور ساتھ ہی دوسری سلطنتوں کے لیے متقل خطرہ بن گئی۔ مہاراجہ کے انتقال اور اس کے جانشینوں کے وقت باقاعدہ فوج۔ پیادہ۔ سوار اور توپ خانے کی تعداد و مصارف کا اندازہ گوشوارہ ذیل سے ہوگا :-

تعداد	توپیں	انخراجات (روپیہ)
۲۹۱۶۸	۱۹۲	۳۸۲۰۸۸

۱۸۳۹ء مہاراجہ رنجیت سنگھ

تعداد	توپیں	اخراجات روپیہ
۵۰۰۶۵	۲۳۲	۵۴۸۶۰۳
۵۰۸۰۵	۲۸۲	۶۸۲۹۸۴
۷۲۳۷۰	۳۸۱	۸۵۲۶۹۶

۱۸۴۲ء - ۱۸۴۳ء مہاراجہ شیر سنگھ
۱۸۴۳ء - ۱۸۴۴ء راجہ بہیرا سنگھ
۱۸۴۵ء - ۱۸۴۶ء سردار جواہر سنگھ
جواہر سنگھ کے زمانے میں توپوں کی تعداد میں جو اضافہ ہوا وہ برائے نام تھا۔
نئی توپیں بہت کم ڈھالی گئیں مگر قلعوں پر کی پرانی توپوں کو صیقل کر کے پھڑپھیوں پر لگادی
گئی تھیں بے قاعدہ سواروں کی تعداد میں باقاعدہ فوج کی مناسبت سے اضافہ نہیں ہوا۔
تسلیم کی لڑائی کی ابتدا یعنی ۱۸۴۵ء میں اس کی تعداد ۱۶۲۹۲ تھی؛
تمام پنجاب میں فوج کی تعداد اس وقت حسب ذیل تھی :-

۵۳۷۵۶	باقاعدہ پیادہ فوج
۶۲۳۵	باقاعدہ سوار
۱۶۲۹۲	بے قاعدہ سوار
۱۰۹۶۸	توپ خانہ
۵۸۴	شتری توپ خانہ
۸۲۷	متفرق

جملہ ۸۸۶۶۲

توپیں - فیلڈ بائری ۳۸۰ - قلعوں کی توپیں ۱۰۴ جملہ ۴۸۴ - شتری توپ خانہ ۳۰۸ -
بے قاعدہ جمعیت فوج اور جاگیرداروں کی امدادی سوار فوج کا شمار مندرجہ بالا
گوشتوار میں نہیں کیا گیا ہے کیونکہ اس کے متعلق صحیح مواد فراہم نہیں ہو سکتا۔ اندازاً
اس کی تعداد ۳۰۰۰ سپاہ کے قریب تھی - مہاراجہ کے فوجی معاملے کے مواقع پر اس فوج
کا منظر خرمنا ہوتا تھا۔ اس میں بہت سے اشخاص آسودہ حال شرفا تھے جو ان سرداروں کی
اولاد یا اعزائے جن کو فوج میں داخل کر دیا تھا وہی رئیس خبر گیری کرتے تھے اور ان لوگوں
کی خوشنمائی سے ان کی وقعت بڑھتی تھی - ان کے لباس یکساں نہ تھے - بعض زرہ بکتر
پہنتے اور سر پر خود رکھتے تھے جن میں طلائی کام اور پروں کا طرہ یا کلنی ہوتی تھی - بعض

مختلف رنگوں کے مخملی لباس۔ گلابی یا زرد پگڑی اور طلائی کام کے پٹکے باندھتے زرق برق لباس میں نظر آتے تھے۔ طلائی پٹکوں پر تلوار و بارت کا سینکڑا لگا رہتا تھا۔ سب لوگوں کی پشت پر چھوٹی سی گندہ گاؤیش کی ادھوڑی کی گول سپر رہتی تھی۔ ان عظیم الشان غمہ سواروں میں کچھ تو تیر کمان سے مسلح ہوتے تھے اور زیادہ توڑے دار بند و قوں سے جن سے خاصی قدر اندازی کرتے تھے۔

باقاعدہ سوار فوج جاگیرداروں کی امدادی سوار فوج کی طرح زرق برق نہ تھی۔ اس فوج کی انگریزی فوج کی نقل سرخ بانات کی چیت وردی تھی۔ جو ہندوستانی فوجوں پر سی طرح زیب نہیں دیتی ان کی تنخواہ کمپنی کی فوج کی تنخواہ سے مناسباً معقول تھی۔ ۱۰ روپے ماہانہ پیادہ کو ملتے تھے لیکن انھیں کوئی وظیفہ نہیں دیا جاتا تھا۔ سواروں کو ۲ روپے دیئے جاتے تھے کیونکہ انھیں گھوڑا اور سامان اپنا رکھنا پڑتا تھا۔

ہمارا راجہ رنجیت سنگھ کے ملکی انتظام کے بارے میں کسی طولانی بحث کی ضرورت نہیں کیونکہ میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ غریب کا اختیار سے دام دام جو اس کے پاس تھا چھین لیا جاتا تھا۔ ظلم و زیادتی کی روک صرف اس اندیشے سے ہوتی تھی کہ کاشتکار بناوت ذکر میں یا بد دل و ناامید ہو کر ارضی ترک کر کے نہ چلے جائیں۔ اصل یہ ہے سکھ زمیندار اس مرغی کو جان سے مارنا پسند نہ کرتے تھے جو سونے کا انڈا دیتی تھی لیکن اس کے پر ایک ایک کر کے جہاں تک بس تھا فوج لیتے تھے۔ بند و بست ارضی کے رپورٹ کے چند فقرات کے یہاں اعادہ کرنے سے ظاہر ہو گا کہ سرکار انگریزی کے عہدہ دار سکھوں کے اس طریقے کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔ سرکار انگریزی کے عہدہ دار جس طرح پر انتظام کرتے تھے وہ سکھوں کے طریقے سے ایسا ہی مختلف ہے جیسا تارکی سے روشنی۔ اور اصل یہ ہے کہ اس طریقے میں سرکار انگریزی سخاوت کے برتاؤ میں زیادتی کر کے غلطی کرتی ہے کاشتکاروں سے اتنی نرمی برتی جاتی جس کے وہ مستحق نہیں۔ سرکار انگریزی بلا معقول وجہ شکایت اس حصہ لگان میں بہت کچھ اضافہ کر سکتی ہے جو وہ ہندوستان کے وسیع قطعات ارضی سے بطور محاصل وصول کرتی ہے۔ میں نے پنجاب کی رپورٹ نظم و نسق باب ۱۷۳-۱۷۴ میں یہ تحریر کیا تھا کہ:-

”کچھ حقیقت زمین کی پیداوار خام کا نصف حصہ تک لے لیا کرتے تھے اور اس کے

علاوہ بہت سے ابواب تھے جو ان لوگوں کو ادا کرنے پڑتے تھے۔ اس کے برخلاف ہمارا ملازم کبھی چھٹے حصے سے زیادہ نہیں ہوا اور اکثر تو آٹھویں دسویں اور بارہویں حصے سے بڑھ کر نہیں ہوتا۔ بعض صورتوں میں تو واسطہ پیداوار کے واسطے خراج کے حساب سے پندرہواں حصہ میں سے لیکر تیس سال تک معین کر دیا گیا ہے؛

رنجیت سنگھ کے آخری زمانے میں جنگی کی آمدنی ۱۶۲۷۰۰۰ روپے اور اخراجات وصول ۱۱۰۰۰۰ روپے تقریباً ۷۱ فی صدی تھے ۱۶۸۰ء کے متعلق جنگی وصول کی جاتی تھی۔ تقریباً روزمرہ کی ہر قابل استعمال شے جس میں شوہینی اور ضرورت کا کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا تھا۔ غربا کے استعمال کی چیزیں مثلاً ایندھن۔ غلہ۔ یا تھکاری پر کسی کم شرح سے جنگی وصول نہ کی جاتی تھی۔ وصول کرنے کا طریقہ نہایت آزار دہ تھا۔ تمام ملک میں جنگی کی چوکیاں قائم تھیں جہاں تجارت کے ساتھ نہایت بدتمیزی اور جبر کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ سامان جب شہر میں داخل ہوتا تو اس پر محصول لیا جاتا۔ دوسری مرتبہ جب وہ دکان پر جاتا تو محصول ادا کرنا پڑتا تھا۔ اور اگر اس کو پھر شہر سے باہر روانہ کیا جاتا تو تیسری دفعہ اس پر محصول عائد کیا جاتا تھا؛

مسٹر ایبٹن نے بندوبست کی رپورٹ سے اقتباسات ذیل اخذ کر کے اپنی قابل قدر رپورٹ مردم شماری باب ۱۳۷ء میں شائع کیے ہیں اس سے نہایت وضاحت سے سکھوں کا طریقہ نظم و نسق معلوم ہوتا ہے اور چونکہ وہ مختلف اضلاع اور مختلف اسناد پر مبنی ہے اس لیے کسی شخص واحد کی رائے کے مقابلے میں اس سے زیادہ تر صیح اندازہ اس طریقے کا ہو سکتا ہے؛

۱۔ پنجاب کی بندوبست اراضی کی رپورٹوں میں تھنی۔ مالی اور تاریخی امور کے متعلق دلچسپ معلومات کا بڑا ذخیرہ موجود ہے اور یہ رپورٹیں انگریزی عہدہ داروں کی جانفشانی و قابلیت کی عمدہ یادگار ہیں اور ہمیشہ رہینگگی۔ ضلع کا کلٹر اس کے متعلق مسٹر ہارنس کی اصل رپورٹ ایک بلند پایہ ادبی تصنیف ہے۔ اور ویسی ہی اسی ضلع کی دوسری رپورٹ سر جے بی لائل کی مرتب کی ہوئی۔ پیشاور کی رپورٹ مرتبہ کپٹن ہیمس قابل قدر معلومات سے مملو ہے۔ پنجاب یا ہندوستان کے دوسرے حصے میں اس بارے میں جو کوشش کی گئی ان میں سے کوئی پائدار دلچسپی فلسفیانہ استخراج جانفشانی اور ادبی لحاظ سے ہمارے بعض نوجوان

سب سے پہلے سرحد پیشاور کو لو۔ کیپٹن جیمس نے تحریر کیا ہے کہ :-
 ”مشتاء سے لیکر ۸۲۰ میل تک پیشاور میں متواتر بل چل چپی رہی۔ اس عرصے
 میں اس کے حکمران برابر بدلتے رہے۔ مگر ان میں کوئی بھی وحشی باشندوں پر حقیقی حکومت
 نہ کر سکا۔ پہاڑی جرگے اسی کا ساتھ دیتے جس سے سب سے زیادہ وصول ہوتا۔ سکھوں
 کا وقتاً فوقتاً اس سمت میں آنا وہاں کے باشندوں کے لیے بلائے جان تھا۔ ان کا وہاں
 پہنچنا اس امر کی علامت تھی کہ مال و متاع اور بیش قیمت اسباب کسی دوسری جگہ منتقل
 کر دیا جائے یہاں تک کہ دروازے اور کھڑکیاں تک نکال لی جاتی تھیں۔ عورتیں
 اور بچے کثیر تعداد میں گھربار چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے اور ملک میں جلاوطنوں کی نوآبادیاں نظر
 آیا کرتیں یہ نفرت زدہ دشمن جہاں تک آگے بڑھتے تمام قطعہ ملک کو برباد کرتے جاتے اور
 جو کچھ سامنے آتا اسے تاخت و تاراج کرتے اور کھیتوں اور زراعتوں تک تباہ کر دیتے۔
 وادی کے وہاں سے لیس کر دریائے سندھ تک شاید ہی کوئی موضع ایسا ہو جسے سکھ
 فوجی افسر نے نہ لوٹا ہو اور وہاں آگ نہ لگائی ہو۔ ان کی آمد سے اس درجہ خوف
 سایا ہوا تھا کہ انہیں اپنے ضدی بچوں کو اس کا نام لیس کر خاموش کرتیں۔ اس ملک
 میں آج بھی سفر کرتے وقت بوڑھے جن کی لمبی سفید ڈاڑھیاں اوچھڑوں پر کثرت سے رنحوں
 کے نشان ہیں ان پہاڑیوں کی نشاندہی کرتے ہیں جہاں سکھ بھڑ بکریوں کی طرح ان کو
 ہٹکا دیتے تھے اور جوان لوگ اب تک ان مقامات کو بتا سکتے ہیں جہاں ان کے
 آباؤ اجداد لڑ بھڑ کے گرے تھے۔ ان کے آنے سے تباہی و بربادی کا لوگوں کو اسدبہ
 یقین تھا کہ چند گاؤں جہاں راستوں کی دشواری سے پہنچ نہ ہوتی دشمن یا تو بالکل چھوڑ
 دیتے تھے اور یا مدافعت کی وجہ صرف ایک حصہ اُس کا انھیں بہ ہیئت مجموعی کم برباد
 کر سکے تھے۔ ناقابل تخیل سمجھے جاتے تھے۔ سمجھتے تھے کہ ان کو ایک زبردست فتح نمایاں
 اپنے دشمن پر حاصل ہوئی؛
 لیکن اس بد قسمت ضلع کے باشندوں کو سکھوں کے واپس جانے کے بعد کے

بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ۔ سیولینوں غلام برسر۔ تھابرین۔ اٹلیس۔ دلس۔ اور ادیرین وغیرہ کی
 مرتبہ رپورٹوں پر ہیئت نہیں لے جاسکتی۔

وقتے میں بھی جیسی نصیب نہ ہوتا۔ اس امر کا اندازہ مشکل ہے کہ آپا سکھوں کے ان خوفناک
مگروقتیہ حملوں نے ان لوگوں کو زیادہ نقصان پہنچایا یا انکی باہمی خاوند جنگیوں نے جو ایک
دوسرے کے ساتھ دشمنی کرنے سے ہو کرتی تھیں اور ایسے افعال یا تو اس وجہ سے سرزد
ہوتے تھے کہ حملہ آور عنایت کا برتاؤ کریں یا اپنے ذاتی کینہ و انتقام لینے کے خیال سے وہ
ان کے ساتھ ہو گئے کیونکہ جیسا پست حالت اقوام کی عموماً عادت ہوتی ہے۔ ان اغراض
کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ دغا کرنے اور چاسوس یا مخبرین کر اپنے ہمسایوں کو سکھوں
کے مظالم میں گرفتار کر دینے میں ان لوگوں کو کوئی باک نہ ہوتا تھا۔ اور اس درجہ کینہ پن
کرتے تھے کہ اگر ان کے آبا و اجداد زندہ ہوتے تو وہ ان افعال سے سخت تنفر کرتے چکیاں
کے سردار کو سکھوں نے جن شرائط پر اراضی دی تھی ان میں سے ایک شرط یہ تھی کہ ہر سال
۲۰ آفریدیوں کے سر پیش کیئے جائیں۔ بڈھا سردار ان دغا بازیوں کو بیان کرنے سے نہیں شرماتا
ہے جو اس شرط کی تکمیل کے لئے اسے بعض اوقات عمل میں لانا پڑتے تھے“ پو

کرل کرکرافٹ اور سٹرا می ایل بریٹڈر تھے کے اضلاع راو پٹنڈی و بہلم کی بندوبست
کی رپورٹ میں ہم کو ملامت ہوتا ہے کہ :-

” صدیوں سے ننتہ و فساد پھیلا ہوا تھا اور بہت زمانہ قدیم سے اس ضلع پر
یونانیوں سے لیکے افغانوں تک کے گروہ حملہ آور ہوا کرتے تھے۔ وہ آمدنی کی تسخیر
ایک باری نازل ہوتے ضلع کا صفایا کر جاتے تھے اور پھر غائب ہو جاتے۔ عارضی بربادی۔
لوٹے ہوئے مکانات اور دیران گھر و قتیہ وقتی بلائیں تھیں اور اب لوگ ان کو بھول گئے
ہیں۔ لیکن اصل میں یہ کام سکھ کارداروں کا ہی تھا جو لاہور سے اتنے دور تھے کہ ان پر
کسی قسم کی نگرانی قائم رہ سکتی تھی۔ کہ انھوں نے گھمکڑ اور راجپوت کو اس افلاس کی حالت
پر پہنچا دیا۔ ان کی حکومت فوجی مطلق العنان جبریت تھی اور ان کا مقصد یہ تھا کہ ایسے تمام
فرتوں و خاندانوں کو نیست و نابود کر دیا جائے جنھیں حکومت کا کوئی دعویٰ ہو اور اس لئے
وہ گھمکڑوں اور ان لوگوں کے مقابلے میں جو انتظام ملک میں ان کے شریک تھے سخت ترین
تدابیر عمل میں لاتے تھے۔ اسی وجہ سے ان میں محض خانہ بدوشی ذلیسل افلاس کی نوبت
پہنچی یہاں تک کہ پہلے جو لوگ ان کے ہروا ہے تھے اب یہ لوگ خود ان کی رعایا
اور کاشتکار ہیں۔ عام راستے عموماً غیر محفوظ تھے مختلف اقوام کی حدود سے گزرنے کے لئے

مسافروں اور قافلوں کو ان لوگوں کو دے دلا کر ان کے حرص و طمع کی آگ بجھانی پڑتی تھی یا انھیں یگوار کرنا پڑتا تھا کہ وہ لوگ انھیں ٹوٹیں اور غفلت ریزی اور بدسلوکی کریں اور بعض اوقات تو بقول شخصے ”جان بچی تو لاکھوں پائے“ کی نوبت ہوتی تھی پھر اضلاع متوسط میں سکھوں کی حکومت کے بارے میں مسٹر ایٹن نے تحریر کیا ہے کہ اس صوبے کے وسط جنوب مغرب میں سکھوں کی حکومت زبردست اور سب جگہوں کی نسبت سے منصفانہ تھی۔ مسلوں کی نمود و ترقی سے پہلے درحقیقت اس کی حالت عام قتل و غارتگری کے نظام سے بہتر نہ تھی لیکن جب سکھوں نے ایک جمعیت کی حیثیت پیدا کر لی اور ان میں قومی جذبات پیدا ہو گئے۔ اگر اور کسی وجہ سے نہیں تو کم از کم خود غرضی کے خیال سے ان کی حکومت میں اعتدال قائم ہو گیا۔ تاہم جیسا کہ سر رابرٹ اجرٹن نے تحریر کیا ہے سکھ آبادی کا ہر فرد بشر سپاہی تھا اور ان کا ایک ہی مقصد تھا وہ یہ کہ ہندو مسلمان کاشتکاروں سے بغیر اس کے کہ انھیں کھیتوں کے چھوڑنے پر مجبور کیا جائے جہاں تک ہو سکے دام و دام وصول کر لیا جائے۔ راجپوت جنھوں نے اپنی ذات کی تعمیر کے خیال سے ایک ایسے جتھے میں شریک ہونے سے انکار کیا تھا جس میں ذات پات کا لحاظ نہ تھا اور اونچی ذات والوں کی کوئی قدر نہ تھی ان کے نفرت و ظلم کا خصوصیت کے ساتھ نشانہ بن گئے تھے۔ ان کی عدم شرکت مخالفت تصور کی جاتی تھی اور جس کسی کے پاس نام چار کو دولت یا اسے کوئی اقتدار حاصل تھا اس کو بے رحمی سے پامال کیا جاتا تھا۔ اسی طریقے کو مد نظر رکھتے ہوئے جس میں کاشتکاروں کی بہت ہی کم حوصلہ افزائی ہوتی ہے جہاں تک ان سے ہو سکا انھوں نے زراعت میں ترقی و توسیع کی لیکن انھوں نے کاشتکار سے بالاتر کسی کو نہ مانا۔ انھوں نے کوئی حقوق ملحوظ نہ رکھے اور نہ کبھی ایسی جائیداد کو تسلیم کیا جہاں ایسے حقوق تسلیم کرنے سے ان کے مالی فوائد پر مخالف اثر پڑتا۔ جو شخص سکھ اور اس لئے سپاہی نہ ہوتا اس کی قدر اس حیثیت سے کی جاتی کہ اس سے لگان وصول کیا جاسکے گا۔ ان کی حکومت اس لحاظ سے باقاعدہ اور غیر جانب دار تھی کہ وہ سب کے ساتھ یکساں جبر و تعدی کرتے تھے پھر

اب ہمیں یہ دیکھا چاہیے کہ راجپوت قوم کی پہاڑیوں میں سکھوں کی حکومت کس قسم کی تھی۔ کوتاہ اندیش راہاؤں نے اپنے خانگی تنازعات کی وجہ سے گورکھوں کو اپنے

ہاں بلا یا تھا اور جیسا کہ بینڈک اور بنگلے کی حکایت مشہور ہے ان وحشی گروہ نے کانگڑا اور شیلے کی پہاڑیوں میں ایک اودھم مچا رکھا تھا یہاں تک کہ تین برس کے فتنہ و فساد سے کانگڑا کی خوشنما وادی جنگل بن گئی اور شہر ویران ہو گئے۔ ایسے وقت میں ہمارا راجہ رنجیت سنگھ اور سکھوں کو مدد کے لیے طلب کیا گیا اور گورکھا ٹیڈی دل کی طرح سے بھاگ گئے۔ لیکن ہمارا راجہ کے سکھ کاردار کچھ ان سے بہتر نہ تھے۔ مسٹر بارنس نے ضلع کانگڑا کی رپورٹ بند و بست اراٹنی میں تجویز کیا ہے کہ:-

”کاردار عدالت و نیز مال کا عہدہ دار ہوتا تھا۔ لیکن اس کی مالی خدمات زیادہ اہم تھیں فیصلے جو رشوت لینے کے بعد صادر کیے جاتے تھے یا نا کافی پولیس ایسی نرم لیاں تھیں گو کہ ان کی جانب توجہ بھی ہو تو بھی نظر انداز کی جاسکتی ہیں۔ لیکن اگر کاردار کے محاصل شاہی کی ادائی میں کچھ بقایا رہ جائے تو حکومت کے ہاتھ سے اس کا بچاؤ اور معافی بالکل ناممکن تھی۔ اس لیے اس کی زندگی کا فریضہ اعظم یہ تھا کہ جہاں تک ممکن ہو کاشت میں وسعت دے اور اسی کے ساتھ کاشتکار کو جتنا ہو سکے مفلس بنائے رکھے۔ لوگوں پر اتنا بار ڈالا جانا تھا جتنا کہ وہ زیادہ سے زیادہ برداشت کر سکتے تھے اور تحمل کی حدیں گزر گئی تھیں۔ دیسی تحصیلدار ایسا ہیوقوف نہ تھا کہ کاشتکار کو بالکل مٹا دے لیکن مٹا دینے کے سوا اور کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے۔ ان کی پالیسی یہ ہوتی ہے کہ سوائے اُس مقدار کے جو کاشتکار کے آزوقے کے لیے کافی ہو چنبھی کوڑی اُس کے پاس نہ بچے۔ لگان عموماً یکساں تھا اور اس کا باوجود یقیناً نرمی اور انصاف کے اصول سے گراں تھا سب کو یکساں برداشت کرنا پڑتا تھا“

دیوان ساول مل ملتان۔ لیہہ۔ ڈیرہ غازی خاں۔ خان کانگڑہ اور چنگ کا صوبہ دار ہمارا راجہ کے تمام اعمال سے بہتر تھا۔ لیکن اوپر لائن جس نے اس کے ایک ضلع منظر گڑھ کا بند و بست کیا تھا اس کے متعلق یہ تحریر کیا ہے کہ:-

”دیوان ساول مل کی حکومت اس کے ماقبل کی حالت سے بہت اچھی تھی۔ اس کی اصل غرض و غایت دیوان کے لیے دولت فراہم کرنا تھا۔ تعمیرات کا کام۔ داورسی۔ جان و مال کی حفاظت ضمنی امور تھے اور صرف اسی وجہ سے ان پر زور دیا جاتا تھا کہ بغیر ان کے زراعت کو فروغ اور مالگزار کی رقم ادا نہ ہو سکتی تھی۔ جب کوئی شخص

اس کے علاوہ ابواب پر غور کرتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ وہ کس طرح محصولات وصول کر کے لوگوں کو خیرات دیتا ان کے مراسم مذہبی ادا کرتا اپنے نزدیک ایک معقول رقم مساکین و برہمنوں کو دیتا اور باقی اپنی جیب میں داخل کر لیتا۔ اپنے وعدوں کے ایفا کے لئے لوگوں سے کس طرح رقم اینٹھتا اور اپنے عہدہ داروں کو رشوت لینے کی ترغیب دیتا اور پھر وہ رقم خزانے میں داخل کر لیتا تو جو وقت اس کے تاریخی حالات کے پڑھنے سے ہوتی ہے اس سے بدرجہا کم اس مشاہدے کے بعد ہوتی ہے۔

ایسے اقتباس کی تائید میں اور سیکڑوں اقتباس انگریزی عہدہ داروں کے لکھے ہوئے پیش کیئے جاسکتے ہیں جنہیں پنجاب کے الحاق کے ۴۴ سال بعد تک پنجاب کے زخم کے اندمال کی کوشش اور اس مدتوں کے اجڑے ہوئے ملک میں دوبارہ خوش حالی۔ آسودگی اور امن چین پھیلانے کی تدابیر عمل میں لانا پڑیں۔ لیکن ہندوستان اور انگلستان کے ان لوگوں کے لئے صرف اتنے ہی اقتباس کا نقل کر دینا سبق آموز ہے

۱۔ اپنے اس بارے میں ذرا بھی شک نہیں کہ دیوان کی کارروائی کے جو واقعات اور بیان کیئے گئے ہیں وہ بالکل صحیح ہیں لیکن میرزا خاں ہے کہ اس کے انتظام کے بارے میں میں نے اپنی کتاب میں چھ میں اس کی اور اس کے نظام بیٹے دیوان مولراج کی سوانح عمری کے بیان کیئے ہیں زیادہ وضاحت سے کام لیا ہے۔ اس کے بیٹے کی دغا بازی دوسری جنگ سکھ کا زیادہ تر باعث ہوئی۔ مرٹھ اور براین نے انتظامات کے جو خصوصیات بیان کیئے ہیں وہ ہندوستانیوں کی نگاہ میں قابل غصہ ہیں۔ اور ویسی انتظام کی عموماً ہی حالت ہے میرزا بیان ذاتی تجربے کی بنا پر ہے کیونکہ مجھے کم از کم شمالی اور وسطی ہند کے ۱۰۰ ریاستوں کے انتظامات سے پوری پوری واقفیت ہے۔ دیوان ساوہل بہنیت مجموعی دانشمند و نیک نہاد صوبہ دار تھا اور گو وہ رشوت لیتا تھا لیکن جابر نہ تھا۔ اس نے دیرانے کو عہدہ کھیتوں کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ لوگ اب تک اس کو وقت کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ اس کا بیٹا کرم ناراین بھی بہت ہردلعزیز تھا لیکن مولراج سے عموماً لوگ نفرت کرتے تھے۔ ”زبان خلق کو نثارۂ خدا سمجھو“۔ عام طور پر یہ کہا جاتا تھا کہ ملتان میں ساوہل (مینہ کا مہینہ) یہہ من کرم (نوازش) اور جہنگ میں جو ملراج کا ضلع تھا مولانا (انج برباد کرنے والا کٹر) تھا

جو دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ انگریزی حکومت سخت گیر و جابر ہے اور جو ہمساری قوم کے ہندوستان میں روشن خیالی سے حکومت کرنے کی عظمت کو قابل سرزنش و شرم تصور کرتے ہیں - انتظام کرنے والے اس سبق کو پڑھ سکتے ہیں - جو کام ہمنے ہندوستان میں کیا ہے وہ ایسے جلی حروف میں ہے کہ تمام آنکھیں سوائے ان کے جو آنکھ ہی بند کر لیں اور دیکھنا نہ چاہیں اسے دیکھ سکتے ہیں - فتنہ و فساد - فحط اور لوٹ مار کی بجائے باقاعدگی اور انصاف کا دورہ ہوا جس کی رو سے ہر شخص اپنی املاک سے مستفید ہوتا اور کوئی اسے ڈرا دھمکانہ نہ سکتا - سکھ ۲۷ شلنگ میں سے ۶ شلنگ لگان وصول کرتے تھے - سرکار انگریزی صرف دو یا ایک وصول کرتی ہے آبادی بہت بڑھ گئی ہے اور زراعت مناسبتاً رو بہ ترقی ہے - اگر انگلستان آج اپنا دست حفاظت کھینچ لے اور اگر ”وہ برطانیہ کی ہے“ کے خاتمے کا اعلان کر دے اور ہندوستان سے علیحدگی اختیار کر کے اپنے فرائض و حقوق سے بزدلانہ طور پر دست بردار ہو جائے تو کیا کوئی سمجھ دار اس امر میں شک کرے گا کہ فتنہ و فساد پر پھر عود کر آئے گا - سکھ - مرہٹے اور افغان جان توڑ لڑائی میں پھر مصروف ہو جائیں گے - حملہ آوروں کے تیغ و سنان پر بچے بلند کیے جائیں گے اور پنجاب کی دو شیزہ لڑکیاں جن پر تنوں کا شکار نہیں گئے اور دہلی اور لاہور کی فصیلیں آتش زدہ مواصلات کی روشنی سے جگمگائیں گی و

باب ششم اس کے ابتدائی فتوحات

مہاراجہ رنجیت سنگھ مہان سنگھ کا بیٹا تھا جو سکرجا کپا ریاست کا ایک نچلا اور دلیر سردار تھا رنجیت سنگھ سنہ ۱۷۶۷ء میں پیدا ہوا۔ اس کا خاندان سانسی جاٹ ذات کا تھا جس کا قریبی رشتہ سندھن والیوں سے تھا رنجیت سنگھ کی وفات کے وقت سندھن والیہ خاندان دریائے بیاس کے شمال کے تمام سکھ سرداروں میں نہایت زبردست تھا اور اب بھی پنجاب میں سب سے بلند مرتبہ پر ہے گواہ اس خاندان میں ممتاز اشخاص موجود نہیں ہیں۔ دوسرے سکھوں کی طرح سندھن والیہ خاندان بھی راجپوت نسل سے ہونے کا دعویٰ ہے لیکن سانیوں کی ذیل اور چور قوم سے بھی اس کا قریبی تعلق ہے اور ان کا آبائی وطن راجہ سانسی جو امرتسر کے ۵ میل کے فاصلے پر ہے اسی نام سے موسوم ہے۔

سکرجا کیا اور سندھن والیہ خاندان کا بانی برہما سنگھ ایک دلیر لیڈر تھا۔ جسے لوٹ مار میں بہت کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ یہ شخص جب اپنی مشہور اہل حق گھوڑی دیسی پرچار ہوتا تو گرد و اطراف کے ملک میں ہل چل مچا دیتا۔ تقریباً چالیس مرتبہ اسے برہمچے۔ توڑے دار بندوق یا تلوار کے زخم لگے اور بالآخر بہتر مرگ پر پڑ کر شاہنشاہ میں ایک ایماندار شخص کی سی موت مرا۔ اس کے دو بیٹے چند سنگھ و نودہ سنگ بھی اپنے باپ کی طرح مچلے تھے۔ سنہ ۱۷۷۷ء کے قریب انھوں نے سکرجا کیا موضع کی از سر نو تعمیر کی جو امرتسر کے ضلع میں واقع ہے اور سکھوں کی ایک جانباز سواروں کی جماعت فراہم کر کے اس کے گرد و اطراف و گہرانوالہ میں بہت سے موضوعوں پر قبضہ کر لیا چند سنگھ سے سندھن والیہ سردار سپیدار ہوئے۔ اور رنجیت سنگھ کا مورث اعلیٰ براہ راست نودہ سنگھ تھا۔ نودہ سنگھ افغانوں سے لڑتا ہوا عجیبھین مارا گیا۔ اس کے بعد صرف ایک لڑکا چرت سنگھ باقی رہا تھا جس کی عمر ۵ سال کی تھی۔ یہ آخر میں بہت طاقتور سردار ہوا اور سکرجا کیا محل کی سرکردگی اپنے

ہاتھ میں لی۔ سردار جہا سنگھ اہلو والیہ اور بھنگی ریاست کی امداد سے اس نے لاہور کے افغان صوبہ دار علید خاں کو اس کے مستقر گجرانوالہ سے نکال دیا اور اس کی تمام توپوں اور ساز و سامان پر قبضہ کر لیا۔ اس نے اہلو والیہ سردار جہا سنگھ کی مدد کی جس پر رام گڑھی والوں نے حملہ کیا تھا اور اس کا مال لوٹ لیا تھا چنانچہ اس کی مدد سے جہا سنگھ نے رام گڑھی کے تمام علاقے پر قبضہ کر لیا۔ جموں کے راجہ رنجیت دیو کے مقابلے پر اس کے فرزند راج دیو کی طرفداری کی غرض سے وہ ہم لب کر گیا لیکن اپنی توڑے دار بندوق کے پھٹنے کی وجہ سے ہلاک ہوا۔

اس کا بڑا بیٹا مہمان سنگھ بجائے اس کے ریاست کا فرمانروا ہوا اور اس نے ریاست کے اقتدار و مقبوضات میں بہت کچھ اضافہ کیا جب اس کے باپ کا انتقال ہوا تو ابھی اس کی عمر ۱۱-۱۲ سال ہی کی تھی اور اس وجہ سے بڑی مصیبت کا سامنا تھا راجپوت راجہ نے بھنگیوں کے سرغنہ سردار جھنڈا سنگھ کو اپنی مدد کے لیے طلب کیا تھا۔ اور اس کے برخلاف کنھیا والے اس کے باغی فرزند کی مدد پر تلے ہوئے تھے۔ جرت سنگھ کی بے وقت موت کی وجہ سے احتمال تھا کہ دشمن کو فتح حاصل ہو جائے لیکن اس کی بیوہ اور سردار جے سنگھ نے جو کنھیا خاندان کا سرغنہ تھا ایک مہتر کور شوت ویر جھنڈا سنگھ کو مروا ڈالا۔ جھنڈا سنگھ پر اس وقت گولی چلائی گئی جبکہ وہ اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ لشکر میں گھوڑے پر سوار گشت کر رہا تھا۔ اس کی موت سے اگلے تنازع کا خاتمہ ہو گیا اور دونوں مقابل فوجیں جموں سے واپس چلی گئیں۔

۱۲۳۰ء میں اپنے باپ کی وفات کے ایک سال بعد مہمان سنگھ نے جیندہ کے راج گجپت سنگھ کی لڑکی راج کور سے شادی کی۔ چھ سال کے بعد اس کے بطن سے ہمارا راجہ رنجیت سنگھ پیدا ہوا۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اس شادی کے بعد ہی فوراً ناچا قیاں پھیل گئیں جو گویا اس بچے کی آئندہ عظیم الشان زندگی کے لیے پیش خیمہ تھیں۔ مہمان سنگھ ہمراہیوں کے جنم غیر کے ساتھ جیندہ آیا تھا اور پھلکیان خاندان کے تمام سردار اس سے ملنے کو وہاں جمع ہوئے تھے عین شادی کی تقریب کے موقع پر جیندہ اور ناچے کے سرداروں میں باہم تنازع ہو گیا۔ یہ نزاع ایک گھانے کے رمنے کے متعلق تھی۔ جو ناچے والوں کی ملک تھا اور اس میں سے براتیوں کو اپنے گھوڑوں کے لیے

گھانس کاٹنے کی اجازت دی گئی تھی۔ ناسمجھے کے سردار کے کارکن نے برایتوں پر حملہ کیا جس سے لڑائی ہو پڑی جیندہ کے راجہ کو جو لڑکی کا باپ تھا اس معاملے سے اپنی عزت میں بڑے گلنے کا بیج پہنچا اگرچہ اس نے شادی کی تقریب ختم ہونے تک خاموشی اختیار کی لیکن انتقام کا مضبوط ارادہ کر لیا۔ شادی ختم ہوتے ہی اس نے ناسمجھے کے سردار ہمیر سنگھ کو فریب سے قید کر کے اس کے ملک پر حملہ کیا اور اس کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا چنانچہ اب تک سنگورو کی جائداد پر قبضہ قائم ہے۔

اس کے بعد کئی سال تک نوجوان مہمان سنگھ کے متعلق کوئی بات سننے میں نہیں آئی۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں جب کہ غالباً وہ جوان ہو گیا ہوگا اس کا نامور بیٹا پیدا ہو چکا تھا۔ جموں کا راجپوت راجہ فوت ہوا اس کے بعد مہمان سنگھ نے اپنی کارروائی ایک مشہور دغا سے شروع کی راجہ برج لال دیو اپنے باپ کا جانشین ہوا اس نے مہمان سنگھ سے دوستی پیدا کی اور بھائی چارے کے طور پر پگڑی بدلی۔ اس کی دوستی پر اعتماد کر کے اس نے چاہا کہ بھنگی سرداروں سے اپنا ملک واپس لے۔ اس نے کنھیا والوں کو جن کا وہ باجگزار تھا اپنی مدد کے لیے بلایا۔ پہلے تو ان لوگوں نے منظور کر لیا لیکن پھر فوراً اس کو چھوڑ کے بھنگیوں کی طرف ہو گئے اور ان سے ملے جموں پر حملہ کر نیکی تجویز کی۔ راجہ نے اپنے نئے رفیق مہمان سنگھ سے مدد طلب کی۔ وہ فوراً شمال کی طرف روانہ ہوا اور کنھیا والوں کے لشکر پر دھاوا کر دیا لیکن نقصان کے ساتھ پسا کر دیا گیا۔ مہمان سنگھ کو اطاعت قبول کرنی پڑی اور راجہ مجبوراً کنھیا سردار حقیقت سنگھ کو پچاس ہزار روپے خرچ دینے پر مجبور ہوا۔ چند ماہ کے بعد جب خرچ کی رقم بقایا میں پڑ گئی تو حقیقت سنگھ نے مہمان سنگھ کو اپنے ساتھ شریک کر کے جموں پر حملہ کرنے پر راضی کر لیا۔ اور یہ قرار پایا کہ مال غنیمت باہم تقسیم کر لیا جائیگا۔ مہمان سنگھ نے اس کو منظور کر لیا لیکن وہ دوسرے راستے سے ہو کے پہلے سے جو پہنچ گیا اور اس نے دیکھا کہ اس میں تنہا حملہ کرنے کی قوت ہے تو اس نے دوستانہ عہدہ کو فراموش کر دیا اور کنھیا سردار کے ساتھ جو معاہدہ ہوا تھا اسے بھی بالائے طاق رکھ کر فہر پر دھاوا کر دیا۔ محلات و آبادی میں آگ لگا دی اور حقیقت سنگھ کے آنے سے پہلے ہی مال غنیمت لیکر چلتا ہوا۔ حقیقت سنگھ کا برا فروخت ہونا واجب تھا لیکن اس میں بدلہ لینے کی سکت نہ تھی اس لیے خاموش ہو رہا۔ اور کچھ عرصے بعد اس کا

انتقال ہو گیا۔ جموں کی بربادی سے کھنیاواؤں کی بڑی ریاست اور ان کے سردار جسے سنگھ کی آتش غضب مہان سنگھ کے برخلاف بھڑک اٹھی اور انھوں نے اس پر ایسی شدت سے حملہ کیا کہ اسے اپنے ملک کے ایک بڑے قطعے کو کچھ عرصے کے لیے چھوڑ دینا اور معافی مانگنا پڑی۔ اس کی اس درخواست کو اس وقت تک منظور کرنے سے انکار کیا گیا جب تک کہ وہ جموں کی لوٹ کا مال واپس نہ دے لیکن سکھ چاکیا سردار نے منقسم ارادہ کر لیا کہ وہ ایسا نہ کریگا۔ اب اس نے کھنیاواؤں کے مقابلے میں دوسرے علاقوں سے اتحاد کیا جس میں رام گڑھیا کا سردار جیسا سنگھ جس کا ملک چند سال قبل چین لیا گیا تھا۔ اور راجہ سرنند کا گڑھیا کا کٹوچہ راجہ شریک تھلہ۔ ان سب نے متحدہ ہر کے اتحادی بنائے کے قریب جو کھنیاواؤں کا صدر مقام تھا ان سے جنگ کی اور بڑے نقصان کے ساتھ انھیں شکست دی۔ یہ واقعہ ۱۷۵۷ء کا ہے۔ سردار جسے سنگھ اس نقصان اٹھانے کے بعد پھر نہ پنپ سکا۔ اس نے کچھ کٹوچہ راجہ کو کاٹکڑہ اور جیسا سنگھ کو اس کا تمام مقبوضہ ملک واپس کر دیا۔ اور وہاں سنگھ کے بیٹے رنجیت سنگھ کے ساتھ اس نے اپنے بیٹے گریش سنگھ کی تابانی ملی مہتاب کو رکی شادی کر رہا۔ اس لڑکی کا باپ گریش سنگھ بٹالہ کی لڑائی میں مارا گیا تھا۔

مہان سنگھ کے مختصر زمانہ حیات کی سازشوں اور بظالم کا ذکر طولانی ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے ہمسایوں اور حریفوں سے برسرِ پیکار رہتا خصوصاً ہنگیوں سے گو اس گروہ کے ایک زبردست سردار صاحب سنگھ نے اس کی بہن سے شادی کی تھی۔ اپنے مرنے سے پہلے دو سال تک وہ اپنے بہنوئی سے اکثر لڑتا بھڑتا رہا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ صاحب سنگھ کے علاقے سے گجرات کا ایک شہر اس سے چھیننا چاہتا تھا۔ خود اس کے متفرق گجرات والہ سے ۲۰ میل شمال کے جانب واقع تھا۔ صاحب سنگھ کے تعلق سدہران کا محاصرہ کیے ہوئے تھا وہ سخت بیمار ہو گیا۔ کرم سنگھ دولا چنیوٹ کا ایک بھنگی سردار صاحب سنگھ کی مدد کے لیے فوراً روانہ ہو گیا تھا۔ مہان سنگھ نے فوراً اس پر حملہ کر دیا لیکن جنگ کے اثناء میں وہ اپنے ہاتھی پر بے ہوش ہو گیا اور فیصلہ اپنے آقا کو یہاں سے واپس لے گیا۔ سردار کی عدم موجودگی کی وجہ سے سکاچا کیا فوج بھاگ کھڑی ہوئی اور محاصرہ اٹھایا گیا خود مہان سنگھ گجرات والہ چلا گیا اور یہاں پہنچنے کے

تین دن بعد ۹۲ء میں صرف سائیس سال کی عمر میں فوت ہوا۔
 اگرچہ باپ کی موت کے وقت رنجیت سنگھ کی عمر صرف ۱۲ سال کی تھی لیکن وہ
 اپنے باپ کے ساتھ لڑائی پر جایا کرتا تھا اس زمانے میں سکھ لوگ نہایت کم عمری ہی میں
 فن جنگ سے واقفیت حاصل کیا کرتے تھے۔ ۹۹ء میں اس کے باپ نے
 منچر قلعے کا محاصرہ کیا تھا۔ یہ قلعہ چھتاہر گے کے ایک مسلمان زبردست سردار
 غلام محمد کا تھا جس کے ساتھ وہ ہمیشہ برسرِ پیکار رہتا تھا۔ غلام محمد کا چچا حشت خاں اس
 ہاتھی کے اوپر چڑھ گیا جس پر رنجیت سنگھ بیٹھا تھا۔ وہ قریب ہی تھا کہ اُس کا خاتمہ
 کر دے۔ جس واقعے سے ہندوستان و انگلستان کی تاریخ میں ایک اہم انقلاب
 واقع ہو جاتا۔ لیکن رنجیت سنگھ کے ایک ساتھی نے اس کا کام تمام کر دیا۔ باپ
 کے مرنے کے بعد اگر اس کی ساس سدا کور کا واسطہ نہ ہوتا تو رنجیت سنگھ کے تمام
 امیدوں کا خون ہو جاتا۔ یہ عورت نہ صرف بڑی قابل تھی بلکہ سردار گرویش سنگھ کی
 بیوہ اور وارث کی حیثیت سے وہ کنھیا سسل کی سرغنہ بن گئی تھی۔ اس نے پورا ارادہ
 کر لیا تھا کہ حتی الامکان تمام اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھے اور دونوں ریاستوں کنھیا
 اور سکرا جا کیا کے افواج کو اپنے تمام حریفوں کے زور توڑنے کے لیے کام میں
 لائے۔ سب سے پہلے اس نے رام گڑھیا والوں سے بدلہ لینا چاہا جو ہٹالے کی
 لڑائی میں شریک تھے جس میں اس کا شوہر مارا گیا تھا۔ ۱۰۶ء میں اپنی فوج کے
 ساتھ نوجوان رنجیت سنگھ کی فوج کو شریک کر کے اس نے رام گڑھیا والے سردار
 ہسا سنگھ پر دریائے بیاس کے قریب اس کے قلعہ میانی کا محاصرہ کیا۔ جتا سنگھ
 نے کچھ عرصے تک تو مدافعت کی لیکن سامانِ خوراک اور پانی ختم ہو گئے تو امرتسر کے
 بڑے پجاری صاحب سنگھ بیدی سے امداد کی استدعا کی۔ بیدی نے سدا کور کے
 پاس پیغام بھیجا کہ محاصرہ اٹھالیا جائے لیکن سدا کور نے یہ دیکھ کر کہ دشمن اس کے
 قبضے میں آگیا ہے اس حکم کی تعمیل سے انکار کیا۔ جتا سنگھ نے دوبارہ بڑے پجاری
 کے پاس پیغام بھیجا جس کے جواب میں پجاری نے کہلا بھیجا کہ وہ لوگ میرا کہنا نہیں
 مانتے مگر خدا خود تمہاری مدد کرے گا۔ اسی غب بیاس میں اس درجہ سیلاب آیا کہ کنھیا
 والوں کے لشکر کے سپاہی۔ گھوڑے اور اونٹوں کی کثیر تعداد اس میں بہ گئی۔ سدا کور

اور رنجیت سنگھ بڑی مشکل سے جانبر ہوئے اور گہرا نوالہ ہٹ آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس ہم نے اس نوجوان سردار کی جنگجو طبیعت کو چھ نکا دیا اور اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اپنی ماں و ساس کی اتالیقی سے آزاد ہو کر خود مختار ہو جائے۔ اپنی ماں سے تو اس نے فوراً ہی چھٹکارا حاصل کر لیا۔ یہ عورت نہایت آوارہ تھی۔ اس کے آشناؤں میں سب سے بڑا دیوان لکھنیت رائے تھا جو رنجیت سنگھ کی نابالغی کے زمانے میں ریاست کا منتظم تھا۔ رنجیت سنگھ نے اس شخص کو ایک خطرناک مہم پر یکمختل روانہ کیا جہاں وہ مارا گیا۔ بعض کا تو خیال ہے کہ رنجیت سنگھ کے ایا سے ایسا ہوا۔ اس کی ماں غائب ہو گئی۔ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ خود اس کے بیٹے نے اپنے ہاتھ سے اس کو مار ڈالا اور بعض کا خیال ہے کہ اُسے اس کے اشارے سے زہر دے دیا گیا۔ لیکن یہ روایتیں اُس کی طبیعت کی افتاد کے خلاف ہیں۔ کیونکہ لڑائی کے موقعوں کے سوا دوسرے مواقع پر سختی و جبر کرنا بالکل اس کے مزاج کے خلاف تھا اور اُس کو عورتوں کی عصمت و عفت کا کچھ ایسا خیال نہ تھا۔ مہتاب کو راہی نہا شدنی سازشوں کی وجہ سے غالباً کسی قلعے میں قید کر دی گئی جہاں کچھ عرصے کے بعد وہ مرنے لگا۔

رنجیت سنگھ کو اپنی ساس سدا کو ر سے گلو خلاصی حاصل کرنا ذرا دشوار امر تھا اور ابتدا میں اس وجہ سے وہ اپنے میں اس کی قوت نہ پاتا تھا اس نے کوئی کوشش اس بارے میں نہیں کی۔ اُس نے رنجیت سنگھ کو کسی قسم کی تعلیم نہیں دی تھی بلکہ چاہتی تھی کہ لہو لعب و عیاشی میں گرفتار رہے اس کی ترغیب دیتی رہتی تھی۔ ہندوستان میں نابالغ شہزادوں کے ولی جنھیں اپنا اقتدار قائم رکھنا اور حقوق غصب کرنا نہ نظر رہتا ہے عموماً اُن کو ایسے مشغلوں میں پھنسا کے اُن کی عافیت اور زندگی کو برباد کر دیتے ہیں۔ آئے دن ماتحت و بیسی ریاستوں میں یہی نقشہ نظر آتا ہے اور اس کے نتائج اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ یہ سرکار انگریزی کے عہدہ دار مقامی (ریزیڈنٹ) کی ہوشیاری اور جرأت کی سخت آزمائش ہے اور سرکار انگریزی کا صیغہ خارجیہ بعض اوقات بڑی کمزوری سے کام لیتا ہے۔ رنجیت سنگھ خوش قسمتی سے ایسا ہوشیار تھا اُس پر اس قسم کی بد عنوانیوں اور عیاشیوں کا مستقل اثر نہ پڑ سکتا تھا۔ اس کی جسمانی قوت ایسی تھی کہ عرصے تک ان بے اعتدالیوں کے ضرر سے محفوظ رہا۔ خاص کارنامائی کا موقع اس وقت پیش آیا

جب کہ ہندوستان کے مشہور حملہ آور احمد شاہ کے پوتے شاہ زماں نے اس خیال سے جنوب کے جانب لشکر کشی کی کہ اگر ممکن ہو تو اپنے آبا و اجداد کا ملک جو ہاتھ سے بھل گیا تھا واپس لے لے۔ ۱۷۶۲ء میں زماں شاہ تیمور کا جانشین ہوا۔ دو سال کے بعد اس نے پنجاب پر حملہ کیا لیکن دریائے جہلم کے آگے جنوب کی سمت نہ بڑھ سکا۔ لیکن ۱۷۶۹ء اور اس کے دوسرے سال اسے زیادہ کامیابی نصیب ہوئی سکھوں نے زیادہ مزاحمت نہ کی اور لاہور پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ سکھوں نے اس موقع پر سب عادت چالاک کی۔ سیمیندان مصاف میں جنگ کرنے سے گریز کر کے افغانی ساتھ لشکر کو پریشان کیا اور جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے ان کو روک کے ساز و سامان لوٹے گئے۔ بعض سکھ سرداروں نے مصالحت کو مناسب سمجھ کے لاہور جا کر شاہ زماں کی اطاعت قبول کر لی۔ نخبت سنگھ نے افغانی حملے سے موقع پا کے جنوب ستلج میں لوٹ مار شروع کر دی تھی انہماں اطاعت کے لیے اپنا بیٹی لاہور روانہ کیا۔ خانگی جنگوں کی وجہ سے جب زماں شاہ کو افغانستان پر کامیابی پر رنجیت سنگھ لاہور کی طرف پلٹا کیونکہ لاہور کے لیے لینے کا یہ وعدہ موعود تھا۔ دریائے جہلم سیلاب کے وقت عبور کرنے میں افغان بادشاہ کی بارہ توپیں غرق ہو گئیں۔ اسے چونکہ ان کے مکالنے کی مدت نہ تھی اس لیے اس نے رنجیت سنگھ سے جو اس وقت اس قلعہ ملک کا مالک تھا یہ وعدہ کیا کہ اگر وہ توپیں برآمد کر کے اس کے پاس بھیج دے تو اسے لاہور کا شہر و ضلع اور راجہ کا خطاب عطا کیا جائیگا۔ رنجیت سنگھ نے بخوشی اس کام کی انجام دہی قبول کی اور اس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہوا۔ بمجلہ ۱۲ کے ۱۷۶۹ء میں اس نے نکلاوا کے پیشاور بھیج دیں اور زماں خاں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ شاہی خطاب کا عطیہ جس بے سود تھا سکھ سردار کو اپنے قوت و بازو سے قبضہ حاصل کرنا پڑا۔ شہر لاہور تقریباً ۲ ہزار سال سے شاہی دارالسلطنت ہوتا چلا آتا تھا۔ سکھ سرداروں کو ہمیشہ اس پر قبضہ کرنے کی خواہش ہوئی۔ اور اٹھارہویں صدی میں متعدد بار اس پر ان کا قبضہ ہوا اور جاتا رہا۔ ۱۷۶۹ء میں لہنا سنگھ اور گوجر سنگھ نے جو دو تہوڑ شاہ بھٹلی سردار تھے بالآخر اس پر قبضہ کر لیا۔ ایک اندھیری رات میں یہ لوگ ہمدرد کے راستے سے اندر داخل ہوئے اور نائب صوبہ دار کو ناچ کی گھنٹیل میں

گرفتار کر لیا۔ جمع ہونے تک تمام شہر پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ اس شہر کو انھوں نے تین حصوں پر تقسیم کیا۔ ایک حصہ سردار سو بھا سنگھ کنھیا کو ملا جو اس سازش میں شریک تھا گودہ عین موقع پر درمیں پہنچا۔ تین سال بعد احمد شاہ نے جب آخری مرتبہ پنجاب پر چڑھائی کی تو اس نے لاہور کے لئے جنگ کرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنا سنگھ کا قبضہ بحال رکھا۔ جب رنجیت سنگھ کو لاہور کا شہر عطا ہوا تینوں سرداروں کی اولاد شہر پر قابض تھی۔ لیکن اپنا سنگھ اور سو بھا سنگھ کے فرزند کمزور اور عیاشی میں سخت مبتلا تھے۔ ان میں سے صرف تیسرے شخص صاحب سنگھ میں کچھ اہلیت تھی لیکن وہ موجود نہ تھا۔ لاہور والے ان لوگوں کی جاہل حکومت سے تنگ آ گئے تھے۔ رنجیت سنگھ کے پاس پیغام بھیجا گیا کہ اگر وہ ان سے نجات دلا دے تو اس کی اطاعت بخوشی قبول کی جائیگی۔ چنانچہ رنجیت سنگھ ایک بھاری فوج لیکر روانہ ہوا۔ اس کے پہنچتے ہی شہر کے دروازے کھول دیئے گئے اور دونوں سردار بغیر مقابلہ کیے فرار ہو گئے؛

۹۹ء میں لاہور پر اس طرح قبضہ پانے اور راجہ کا خطاب جائز طور پر حاصل کر کے رنجیت سنگھ ۲۰ سال کی عمر میں ایک زبردست سردار بن گیا۔ سکھ امرا اس کی کامیابی سے بہت خائف ہوئے اور خاص طور پر بھنگی ان کی راجدھانی پر قبضہ کرنے کی وجہ سے اس سے بے بسر انتقام ہو گئے۔ سن ۱۷۷۷ء میں اس کے خلاف ایک جماعت قائم ہوئی جس میں سردار جٹا سنگھ رام گڑھیہا۔ صاحب سنگھ و گلاب سنگھ بھنگی زیادہ سربرآوردہ تھے۔ قرار یہ پایا کہ بھسین میں ایک مجلس مشورہ مقرر کی جائے اور وہاں رنجیت سنگھ کا کام تمام کر دیا جائے۔ لیکن رنجیت سنگھ ان کے پھندے میں کب پھنسنے والا شخص تھا وہ بھسین جاتے وقت اس قدر کثیر تعداد فوج کی اپنے ہمراہ لے گیا کہ کسی کی ہمت اس کام کے انجام دینے کی نہ پڑی۔ دو مہینے تک سیر و شکار میں مصروف رہنے کے بعد وہ لاہور واپس آ گیا۔ لیکن جو سازش بھنگیوں نے اس کے خلاف کی تھی اس سے وہ ناواقف نہ تھا اس نے اس بارے میں خود پیش قدمی کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ سن ۱۷۷۸ء میں اس نے ان کے صدر مقام امرتسر پر شہر توپ زور سے

۱۵ یہ مشہور توپ جس کے تفصیلی حالات پنجاب کے سردار کے صفحات ۸۸ - ۸۷ میں

کے مطالبہ کے لئے آدمی روانہ کیا جو اس کے دادا چرت سنگھ کو ۶۴ لاکھ میں لاہور کے مال غنیمت سے بطور حصہ دی گئی تھی بھنگیوں نے اس کے دینے سے انکار کیا اور اس بنا پر رنجیت سنگھ نے ان کے قلعہ امرتسر پر حملہ کر دیا اور انھیں وہاں سے نکال دیا انھوں نے مجبور ہو کر رام گڑھیا والوں کے پاس پناہ لی جن کے ساتھ انھوں نے امرتسر کو تقسیم کر لیا تھا اور ان کے مقبوضات الحاق کر لئے تھے تو اس ہزرت و کامیابی کی وجہ سے رنجیت سنگھ سکھوں کے مذہبی و ملکی دونوں صدر مقاموں پر قابض ہو گیا اور اسے اپنے فتوحات کے متعلق آنند کوئی اندیشہ نہ رہا کیونکہ کھنیا والوں کی بڑی ریاست بالکل یہ اس کے قبضہ اختیار میں تھی اور رام گڑھیا کا مشہور سردار جتا سنگھ ضعیف و سربسیدہ ہو چکا تھا اور رنجیت سنگھ جانتا تھا کہ اس کی جاگیر پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے زیادہ انتظار کرنا نہیں پڑے گا۔ سال آئندہ اس کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا جودھ سنگ گوہارا سپاہی تھا لیکن نہایت سادہ مزاج تھا اور مہاراجہ کا (کیونکہ اب رنجیت سنگھ کو مہاراجہ کہنا بجا تھا) وفاقوار ہو گیا تھا۔ ایسی حالت میں ریاست کو بہ جبر لینا غیر ضروری ضرورت تھی۔ جودھ سنگھ نے رنجیت سنگھ کے ساتھ ہمیشہ رفاقت کرنے کی قسم کھائی اور رنجیت سنگھ ہر طرح اس کی خدمت و دلجوئی کرنے لگا۔ رام گڑھیا کے قلعے کے طرز پر امرتسر میں اس کے لئے نیا قلعہ تعمیر کیا گیا جو وہ سنگھ رنجیت سنگھ کے ساتھ نہایت میں اکثر شریک ہوا۔ سال ۱۷۹۹ء میں جودھ سنگھ کا انتقال ہوا اور اس کے بعد اس کا جانشین رنجیت سنگھ سے برسرِ پرخاش ہوا رنجیت سنگھ نے قلعے پر قبضہ حاصل کر کے اسے سمار کر دیا اور تقریباً ایک سو اور چھوٹے چھوٹے قلعے شکست کر دیئے اور اس ریاست کے مقبوضات جو امرتسر۔ جالندھر و گرداسپور میں تھے الحاق کر لئے۔ مفتوحہ خاندانوں کے سرگروہوں کو اس نے اچھی اچھی جاگیریں دیں اور فوج میں یا اپنے پاس مغزِ عہد سے عطا کیئے تو سلسلہ میں نکالی ریاست کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ یاد ہو گا کہ رنجیت سنگھ نے

بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ۔ بیان کیئے گئے ہیں امر شاہ نے لائے میں لاہور میں ڈھلوائی تھی۔ اب یہ کوہ لاہور کے عجائب خانے کے روبرو رکھی ہوئی ہے تو

۱۸۰۲ء میں ایک نکائی لڑکی سے شادی کی تھی اور صرف اسی کے بطن سے رنجیت سنگھ کی اولاد پیدا ہوئی تھی۔ لیکن اس شادی سے رشتہ داروں میں اپنے تعلقات قائم نہ ہوئے۔ ۱۸۰۷ء میں جب کانگھ سنگھ راج کورانی کا بھتیجا خاندان کا رئیس ہوا تو مہاراجہ نے اُسے دربار میں آکر رہنے کی ترغیب دی لیکن کانگھ سنگھ جانتا تھا کہ ایک دفعہ آنے کے بعد پھر چھٹکارا محال ہے۔ مرغ اسیر کو گرفتار ہونیکے بعد پھر رہائی نصیب نہیں ہوتی۔ اس لیے اس نے سخت انکار کر دیا۔ مگر اس انکار پر بھی اس کا بیچنا نہ چھوٹا کیونکہ مہاراجہ نے اس کی تمام جاگیریں قصور، چونیان اور گوگیر میں لاہور سے اس قدر قریب واقع تھیں کہ اُس کا بچانا بالکل ناممکن تھا الحاق کر لیں۔ مہاراجہ کے طریق عمل کی یہ عمدہ مثال ہے۔ اس بات کے لیے کوئی جیلہ اس کے پاس موجود نہ تھا اور کانگھ سنگھ جو قریبی رشتہ دار تھا سوائے اس کے کہ ان کے بچانے کی طاقت نہ رکھتا تھا کوئی قصور نہیں کیا تھا؛

سب سے آخری بڑی ریاست جو مہاراجہ کے دست تصرف میں آئی وہ کنھیا کی تھی جس کی ریٹھ اس کی ساس سدا کور تھی۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اس عورت نے شیر سنگھ اور تارا سنگھ دو لڑکے اس کے رو برو یہ کہنکوش کئے کہ وہ جہتاب کور کے بطن سے اس کی اولاد ہیں۔ اس فریب کو جس کے اسباب باب آئندہ میں بیان کئے جائینگے مہاراجہ نے ملکی مصالح کے لحاظ سے درست مان لیا تھا لیکن اس امر کا مصمم ارادہ کر لیا کہ اس کا بدلہ مناسب موقع پر لیا جائے۔ یہ موقع اس وقت تک حاصل نہ ہوا جب تک کہ شیر سنگھ کی عمر ۱۲ سال کی نہ ہوئی اور ہزارے میں برائے نام فوج کی سرکردگی پر اسے روانہ نہیں کیا گیا۔ اس مہم میں بہادر سردار دیوان رام دیاں یوسف زئیون کے ہاتھ گندگڑھ میں مارا گیا۔ اس موقع پر شیر سنگھ نے بہت عمدگی سے کام انجام دیا اور اس سے واپس آنے پر مہاراجہ نے مائی سدا کور جس نے شیر سنگھ کو اپنا بتائی بنا لیا تھا یہ مشورہ دیا کہ اب اس کا وقت ہے وہ دنیاوی امور سے بطور مناسب کنارہ کش ہو کے اپنے نواسے کو ریاست کا کام تفویض کر دے؛

بڑھی رانی ترک ریاست کے لیے آمادہ نہ تھی لیکن وہ لاہور سے چند میل کے فاصلے پر شاہ جی کے مقام پر مقیم تھی اور یہ ظاہر تھا کہ اب انکار سے خراب نتائج پیدا ہونیکا

اندیشہ ہے اس لئے اس نے لیت و لعل شروع کیا اور اپنے صدر مقام بٹالے واپس جا کر اس نے انگریزوں سے نامہ و پیغام شروع کیا اور ان سے التجا کی کہ اسے ان کے زیر حفاظت تلج اس پار کے ملک میں سکونت کرنے کی اجازت دیجائے۔ ہمارا جہ کو بھی اس پیغام بھیجنے کا حال معلوم ہو گیا اور اس نے سد اکور کو اپنے سامنے طلب کر کے اپنے سابق حکم کا ڈراؤنڈھکا کر عادیہ کیا۔ مائی سد اکور اسی شب میا۔ نے میں سوار ہو کر فرار ہو گئی لیکن رنجیت سنگھ کے سپاہیوں نے تعاقب کر کے اسے گرفتار کر لیا اور اسے ایک قلعے میں محبوس کر دیا گیا جہاں کچھ عرصے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اور ہمارا جہ نے اس کی تمام بڑی بڑی جاگیروں کو بلا کسی مزاحمت کے ملحق کر لیا اب صرف اٹلاڈھ اور مکی کے قلعوں پر مدافعت رہ گئی۔ اتنا لڑاؤ کے قلعے میں سد اکور کی ساتھی ایک عورت نے مقابلہ کیا اور مکی پر دیوان فستج چند کو جو اس کی تسخیر کے لئے روانہ کیا گیا تھا بہت قہقہے میں آئیں۔ بٹالہ شیر سنگھ کو جاگیر میں دیدیا گیا اور یہ چالاک عورت جس نے یہ چھوٹا شہزادہ بنا کے کنواں دوسروں کے لئے کھودا تھا خود اسی میں گر گئی۔ یہ امر بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ گو سد اکور سے اور قیصر ہوئے ہوں لیکن ہمارا جہ کے ساتھ اس نے نیکی کی تھی لیکن ہمارا جہ نے اس کے ساتھ نہایت ناشکری کا سلوک کیا۔ اس کے روپے اور فوج سے ہمارا جہ کو لاہور و امرتسر پر قبضہ نصیب ہوا اور باپ کے مرنے کے بعد جو کشمکش کی حالت تھی اس سے اسی کے بدولت اسے بجات حاصل ہوئی پو۔

باب نہم

انگریز اور ستلج اس پار کا قطعہ ملک

مہاراجہ صرف ایک دوستی میں ثابت قدم رہا اور اسی ایک اتحاد سے اس نے کبھی گریز نہیں کیا۔ یہ دوستانہ اتحاد انگریزی سلطنت کے ساتھ تھا۔ جس کی نمایندہ اس زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی تھی۔ اس صدی کے اوایل میں جب تک وہ انگریزوں کی مصلحت و اقتدار سے پورا پورا واقف نہ تھا وہ اس شش و پنج میں رہا کہ ان پر دوسروں کے ساتھ کس طرح کا سلوک کیا جائے اور مشاعرے میں تو اس نے تقریباً جنگ کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن جب مشاعرے کے معاہدے کے مطابق ان کی اوچھڑاس کی حیثیت کا ایک مرتبہ تصفیہ اور تصدیق ہو گئی جس کی رو سے اس نے ستلج اس پار کے تمام سرداروں پر سے اپنا اقتدار اٹھالیا تو اس نے ان فرائض و ذمہ داریوں کو خوشی سے قبول کر لیا جو اس معاہدے کی رو سے اس پر عاید ہوئی تھیں اور ۳۳ سال تک سرکار انگریزی کا بھادوار ریشی بنا رہا۔ اس نے حکومت انگریزی کے وعدوں پر ایسا پورا پورا اعتماد کیا جس کا ایسے شکی اور بے پاک فرماں روا سے عجب ہوتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس کی انگریز مصلحت بینی کا یہ بہترین ثبوت ہے۔ مہاراجہ کا اعتبار انگریزی حکومت سے بچا نہ تھا۔ حکومت انگریزی نے بھی ہمیشہ رنجیت سنگھ کے ساتھ آزادانہ اور دوستانہ برتاؤ کیا کیونکہ سرکار انگریزی سمجھتی تھی کہ اس وقت کے غیر منظم صوبے اور شمال مغربی سرحد کے دروں کی غیر معلوم طاقت کے مابین یہ شخص روک تھام کا کام دیکھا۔ جہاں سے ہندوستان کے میدانوں میں حملہ اور فوج کا ہمیشہ سیلاب جاری رہا چھاپسی وجہ سے کبھی اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ لاہور کی ریاست خود اپنی اندرونی خرابیوں کی وجہ سے معرض زوال میں آئی نہ کہ سرکار انگریزی نے اس کے مخالف کوئی منصوبہ نہیں کیا تھا۔

ہندوستان کی تاریخ میں ہماری حکومت کی ابتدا اس کا ستلج اس پار کی

ریاستوں اور مہاراجہ سے تعلق پیدا کرنے کا باب بہت سبق آموز ہے۔ لیکن وہ اس قدر طولانی ہے کہ اس کا اعادہ یہاں نہیں ہو سکتا۔ اس کا تعلق مرہٹوں کے اور ان کی تربیت یافتہ فوج سے ہے جو فرانسیسی جنرلوں کے زیرِ کمان رہیں۔ نیسہر جارج طامس کے حیرت انگیز واقعات زندگی سے جو ایک انگریز تھا اور جس نے بڑی جرأت و بہادری سے شمالی ہند میں ایک سلطنت کی بنیاد قائم کرنے کی کوشش کی تھی جس میں اسے کامیابی ہوتے ہوئے رہ گئی ان واقعات کا صرف سرسری طور پر بیان کیا جاسکتا ہے۔

اس صدی کے اوایل میں سرکارِ انگریزی کی قوت ہندوستان میں سیلاب کی طرح جلد جلد بڑھ رہی تھی۔ نقشے میں جس سرخ لکیر سے اس کی حد بندی کی گئی تھی۔ اس میں روز بروز وسعت ہو رہی تھی اور خود رنجیت سنگھ نے اس امر کی بالکل صحیح پیش گوئی کی تھی کہ ایک دن تمام ہندوستان سرخ ہو جائیگا۔ بنگال۔ بنارس۔ اودھ۔ الہ آباد۔ کانپور۔ فتح آباد کیے بعد دیگرے مطیع ہو چکے تھے کہ ۱۱ ستمبر ۱۸۰۳ء کو جنرل لیک نے مرہٹوں کی فوج کو جو پورقین کی سرکردگی میں تھی دہلی کی فضا کی نیچے شکست دی اور اس کے چار دن بعد ہندوستان کے دارالسلطنت میں بحیثیت فاتح داخل ہوا۔ یکم نومبر کو سواری کی جنگ ہوئی جس میں مرہٹوں کو دوبارہ نقصان عظیم کے ساتھ شکست ہوئی اور سندھیا نے سرجی انجن گاؤں کے معاہدے کی رو سے سرسہ۔ حصار۔ رہتک دہلی۔ گرگاؤں اور آگرہ سرکارِ انگریزی کے حوالے کر دیئے۔ لیکن ان میں سے پہلے تین اضلاع پرستہ ۱۸۰۳ء تک سرکارِ انگریزی نے اپنا عمل دخل نہیں کیا۔

شیخ اس پار کے سرداروں نے مرہٹوں سے دوستی کر لی تھی اور جنرل بوکرین نے کیونکہ ان کے دشمن جارج تامس کو ابھی شکست دے دی تھی انھوں نے انگریزوں سے دہلی میں جنگ کی۔ مگر انھوں نے ہماری طاقت کا غلط اندازہ کیا تھا۔

۱۵ ان واقعات کے تاریخی حالات کی تصریح ”پنجاب کے راجاؤں“ کی اشاعت دوم صفحہ ۸۳-۱۳۰ میں کی گئی ہے۔

۱۷۵۷ء میں برابر سال بھر تک جتنا کہ آس پاس انگریزوں کو بہت پریشان کیا اور دہلی کی فصیل تک ملک میں لوٹ مار مچاتے رہے لیکن کرنل برن نے جب ۱۸ اڈسمبر ۱۷۵۷ء کو انھیں سخت شکست دی تو انھوں نے دریا پار جا کر دم لینا غنیمت سمجھا اور ان کے دوسرے برادرہ سردار جندھہ کاراجہ بھاگ سنگھ اور کیتھال کاراجہ بھائی لال سنگھ انگریزی فوج سے جا ملے اور ہمیشہ کے لئے ان کے رفیق ہو گئے۔

اکتوبر ۱۷۵۷ء کو جس وقت راڈ ہلکر نے جس نے کرنل مانسن کی بریگیڈ پر فتح عظیم حاصل کی تھی فوج کثیر سے دہلی کا محاصرہ کیا لیکن کرنل اختر لونی اور کرنل برن نے اسے پساکر دیا۔ دو مہینے بعد فتح گڑھ اور دیگ پر جنرل لیگ و جنرل فریزر نے سخت قتل و خون ریزی کے بعد مرہٹوں کو شکست فاش دی۔ ان کا سردار ہلکر بے فوج رہ گیا۔ کچھ عرصے تک تو وہ اس فضول کوشش میں رہا کہ تلج کے جنوب میں پھر فوج جمع کرے لیکن بعد میں وہ شمال کے جانب سکھوں سے امداد لینے کے لئے چلا گیا جن کی امداد اگرچہ مدد صیاء کی امداد کے مقابلے میں زیادہ کارگر نہ تھی لیکن اس سے زیادہ قابل اعتماد تھی۔ مدد صیاء بظاہر تو اظہار دوستی پر مجبور تھا لیکن دل میں ہلکر سے سخت تنقید تھا۔ ہلکر کئی مہینے تک پٹیلے میں رہا لیکن پٹیلے کے مہاراجہ نے اس کی مدد کر کے خود نقصان اٹھانا گوارا نہ کیا اور تلج اس پار کے دوسرے سرداروں نے بھی یہ دیکھ کر کہ اس کی کامیابی کی امید نہیں ویسی ہی دانشمندی اختیار کی۔ بالآخر ۱۷۵۷ء میں لارڈ لیک اور ہلکر سے دوبارہ سرمیدان جنگ کی ٹہری تو وہ امرتسر بھاگ گیا اور رنجیت سنگھ کو ملانے کی کوشش کی۔ رنجیت سنگھ بھی اس کی امداد پر بہت کچھ آمادہ ہو گیا تھا لیکن اس کے شیر فتنہ اہلو والیا اور جندھہ کے راجہ نے اسے باز رکھا اور نہ فوراً انگریزوں سے اس کی مدد بھیج دی جاتی۔ لارڈ لیک نے بیاس تک ہلکر کا پیچھا کیا اور اگر گورنر جنرل کو اس کی دھن نہ ہوتی کہ جس قدر جلد ہو سکے صلح کر لی جائے تو ہندوستان میں انگریزوں کے سخت ترین دشمن کا بالکل خاتمہ ہو جاتا۔ مگر اس وقت لندن کی مجلس نظماً کو پھر بڑولی کی ہوک اٹھی ہوئی تھی۔ لارڈ ویلزلی کی جو گورنر جنرلوں میں سب سے زیادہ سردار آورہ تھا بے باک حکمت عملی سے خائف ہو کر کارنوالس سا کمزور شخص ان کا روائیوں کے پلٹ دینے کے لئے بھیجا گیا۔

حاجت سے باہمی آشتی کو بڑی دانشمندی تصور کیا گیا۔ ہلکے کے ساتھ ایک معاہدہ کیا گیا جس کی رو سے اسے اس قطعہ ملک کا حصہ کثیر واپس دیدیا گیا جو اس سے قبل چھین لیا گیا تھا۔ یکم جنوری ۱۸۱۷ء کو ایک ضمنی معاہدہ رنجیت سنگھ اور اہلودالہ سردار کے ساتھ کیا گیا۔ یہ معاہدہ گویا آئینل ایسٹ انڈیا کمپنی اور سرداران رنجیت سنگھ و فتح سنگھ کے مابین اتحاد و دوستی قائم کرنے کی غرض سے کیا گیا تھا جس کی رو سے رنجیت سنگھ جو نت رادہ ہلکے کو فوراً اتر سر سے باہر بھیج دینے اور آئندہ کسی قسم کا تعلق نہ رکھنے یا فوج یا کسی اور طریقے سے اس کی مدد نہ کرنے کا اقرار کیا۔ سرکار انگریزی نے اس کے معاوضے میں وعدہ کیا کہ جب تک یہ سردار سرکار انگریزی کے دشمنوں سے کسی قسم کا دوستانہ تعلق نہ رکھیں گے یا سرکار انگریزی کے خلاف مخاصمانہ برتاؤ کرنے سے محترز رہیں گے اس وقت تک نہ انگریزی فوج ان کے ملک میں داخل ہوگی اور نہ سرکار ان کے ملک یا مقبوضات کو ان سے لینے یا انھیں بیدخل کرنے کی کوئی کارروائی کرے گی؛

یہ معاہدے جن سے ہلکے پنجاب سے خارج ہوئے رنجیت سنگھ کو عملاً انگریزوں کی دست اندازی سے نجات ہوئی کہ وہ اپنے منصوبے شمالی تلج میں فتوحات کرنے کے لیے کام میں لائے۔ اس دریا کے جنوب کا قطعہ ملک جو سکھ سرداروں کے قبضہ میں تھا اس وقت معرض بحث میں نہ آیا تھا۔ ۱۸۱۷ء کے موسم گرما میں پھلکیان راجاؤں کے باہمی تنازعہ نے رنجیت سنگھ کو حملہ کرنے پر آمادہ کر دیا۔ اس پر نصیب علاقے کی حالت بے حد قابلِ مأسفہ تھی۔ سکھ ریاستوں اور دہلی کے مابین کے اضلاع کی حالت جنھیں انگریزوں نے ۱۸۱۷ء میں حاصل کیا تھا شاید بہت قابلِ رحم ہو رہی تھی لیکن اس قطعہ ملک کے اس حصے کے مزارعین کی حالت بھی پوسکھوں کے حدود میں تھی ویسی ہی خراب تھی۔ مسٹر ڈیٹرنلی ایٹکسن نے کربال کی رپورٹ پر بددست اراضی میں تجربہ کیا ہے کہ :-

”اس طرح کے زمانے میں اس ہولناک زمانے کا خاتمہ ہوا جس کو لوگ عموماً سکھا شاہی یا مرہٹوں کے زمانے کی بدعنوانی کہتے ہیں۔ اب تک دیہاتوں کے دلوں میں اسکی یاد تازہ ہے۔ درحقیقت کبھی پانی بہت کے جنوبی قطعہ ملک پر سکھوں کا قبضہ قائم رہا۔

اور اس علاقے میں جو کچھ ان کے مقبوضات تھے وہ مرہٹوں کے باجگزار کی حیثیت سے تھے۔ لیکن یہ تمام زمانہ ان دونوں قوموں کے باہمی تنازعات میں گزرا اور یہ قطعہ ملک دونوں کے مقبوضات کے مابین ایک لاوارث ملک تھی۔ دونوں اس کو لینا چاہتے تھے مگر حفاظت کا ذمہ کوئی نہ لیتا تھا۔ یہ قطعہ درحقیقت اُس کا شکار تھا جو اس وقت سب سے زیادہ قوی اور دلیر اور لڑا جوتا۔ سکندریہ میں بھی نادر شاہ کو دو آب کے راستے سے دہلی جانا پڑا تھا کیونکہ مرہٹہ فوجوں کی ہمیشہ آمد و رفت کی وجہ سے یہ قطعہ اس درجہ ویران ہو گیا تھا کہ یہاں رسد کا ملنا ناممکن تھا۔ اور چالیس سال بعد جب ہم نے اس ضلع کو اپنے قبضے میں لیا تو یہ اندازہ کیا گیا کہ اس قطعہ ملک کا پچھلے حصہ جنگل ہو گیا تھا اور یہاں کے باشندوں کا استیصال کر دیا گیا یا جلا وطن ہو گئے۔ شاہی نبردت سے خشک پڑی ہوئی تھی اور زراعت کی جگہ گھنے جنگل ہو گئے جو لٹیروں خانہ بدوشوں اور درندوں کا مامن تھا۔ شہرے میں مسٹر آرچر نے یہ بیان کیا کہ چند سال قبل تک تمام ملک وحشی جانوروں سے بھرا ہوا تھا شارع عام کے آس پاس ویران کھنڈر اب تک اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ لوگوں کو ان مستحکم سے مستحکم مواضع کو بھی ترک کرنا پڑا جہاں ان کے آبا و اجداد صدیوں سے آباد تھے وہ ان کو چھوڑ کر ایسے مقامات پر آباد ہونے کے لئے مجبور ہوئے جو قزاقوں کے دستبرد سے کسی قدر محفوظ تھے۔ تحصیل لگان کا اس وقت کوئی انتظام نہ تھا۔ کاشتکاروں کی حالت یہ تھی کہ تلوار ہاتھ میں لئے ہل چلایا کرتے تھے۔ محصول وصول کرنے والا اپنے ساتھ فوج لیکر لگان وصول کرنے آیا کرتا تھا اور اگر وہ اس مہم میں کامیاب ہو گیا تو اس کے پیچھے دوسرا فوراً موجود ہوتا تھا تاکہ بچی بچی رقم کو وصول کر کے چلتا ہو۔

رجحیت سنگھ اپنے چچا جیندہ کے راجہ بھاگ سنگھ کے بلانے سے ۲۶ جولائی ۱۷۵۷ء کو کثیر لشکر کے ساتھ ستیج عبور کر کے بھاگ سنگھ اور مہاراجہ پٹیلہ کے باہمی تنازع کے تھپسے کے لئے گیا۔ انگریزوں کو اس کی آمد سے پاک گو نہ انتشار رہا اور انہوں نے کرنال میں اپنی فوجی قوت مستحکم کر لی لیکن رجحیت سنگھ ایسا بے احتیاط نہ تھا کہ انہیں چھیڑتا۔ وہ صرف لدھیانے اور کھوگرانے کے اضلاع پر قبضہ کر کے فائدہ ہو گیا

جس کو اس نے اپنے دوستوں پر تقسیم کر دیا لدھیانے کا خاندان قدیم راجپوت مسلمانوں کا تھا اور اس وقت دو بیوائیں اس کی پس ماندہ تھیں رنجیت سنگھ نے سخت بے حیائی سے اُن کے تمام مقبوضات کو لوٹ لیا۔

دوسرے سال اسی موسم میں وہ پٹیا لے پھر آیا۔ اس مرتبہ ایک کثیر تعداد فوج کی دیوان مکھم چند کے زیرِ کمان اس کے ہمراہ تھی۔ اس نے راجہ صاحب سنگھ اور اس کی بیوی مشہور رانی اس کو ر کے درمیان صفائی کرا دی جس سے دوسرے فریق کو جس نے بہت سی رشوت دی تھی بہت کچھ فائدہ ہوا۔ اب کی واپسی میں اُس نے بہت سی جائیدادیں مثلاً ناراین گڑھ۔ ودنی۔ مزڈا۔ زیر اور غیرہ جو زیادہ تر فریور پور کے ضلع میں واقع تھیں چھین لیں اور انھیں اپنے متوسلوں پر تقسیم کر دیا۔

ستلج اس پار کے سردار اب سمجھ گئے کہ آپس کے جھگڑوں میں دخل دینے کے لئے رنجیت سنگھ کو بلا کے خود ایک ایسا دیو پیدا کر لیا ہے جو اُن کے قابو میں نہیں رہ سکتا۔ اسی وجہ سے مابج مشہور اے میں جھنڈ کارا جہ پھل کا بھائی لال سنگھ جو ایک سربراہ اور سردار تھا پٹیلے کے راجہ صاحب سنگھ کے نایب کو ساتھ دہلی لے گیا کہ سرکار انگریزی کے رزیڈنٹ مسٹر سیٹن سے ملے اور دریافت کرے کہ آیا سرکار انگریزی ان کو اپنی حفاظت میں لینے پر آمادہ ہے یا نہیں۔ سرکار انگریزی چاہتی تھی کہ ایسا ہی سمجھا جائے لیکن اس امر کا پس و پیش تھا کہ سب سے بہتر طریقہ اس کو انجم دینے کا کیا ہو۔ حکام انگریزی چاہتے تھے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ملک گیری کا حوصلہ ستلج کے شمالی جانب تک محدود رہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم تھا کہ رنجیت سنگھ کا مصمم قصد ہے کہ دریا کے شمال و جنوب دونوں طرف کے سکھوں پر اپنا اقتدار قائم رکھے اور اس لئے اسے یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ اس طرح یکبارگی مداخلت کرنے سے کہیں دوستانہ تعلقات میں رخنہ نہ پڑے اور وہ فرانسیسیوں کے ہتے چڑھ جائے۔ گو اس وقت جبکہ فرانس کے مقبوضات ہند صرف دو یا تین معمولی بستیوں پر محدود ہیں یہ امر تعجب خیز معلوم ہو لیکن صدی کے اوایل میں حالات اس سے بالکل مختلف تھے۔

انگریزوں و فرانسیسیوں کے مابین رقابت چلی آرہی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان میں سے جو دور رہے اسی کو دنیا میں تجارتی و ملکی اقتدار حاصل ہو۔ ہندوستان

میں بھی یہ مخالفت ایسی شد و مد سے ہوتی رہی جس طرح دوسرے ممالک میں اور بالآخر اس کا خاتمہ ۱۸۱۹ء میں برطانیہ کے معاہدے سے ہوا۔ اس وقت سے ہندوستانی علاقے میں انگریزوں سے دشمنی و نفرت کی روایتوں کو فرانسیسیوں کے قابلِ جبرئیل بڑھاتے رہے مثلاً کامٹی ڈی پوانی۔ پیرن اور بورقین نے مرہٹوں کے خانہ بدوش جڑگوں کو اسی طرح ترتیب دے کر آراستہ فوج بنا دیا جس طرح وینٹورا۔ ایڈرڈ اور کورٹ نے ۴۰ سال کے بعد خالصہ کی فوج کو مرتب کیا۔ اس کے بعد فرانسیسی بادشاہوں کے غضب اور جمہوریت کے غیظ سے بدرجہا زیادہ نیپولین کی فراست و اولوالعزمی سے ایشیا و یورپ کے مطلقہ بادل سے گھرے ہوئے تھے۔ مرہٹو اسٹریٹجیٹکس کی توپوں کی گونج طہران و لاہور تک پہنچی اور ایشیائیں کوئی دربار ایسا نہ تھا جہاں اس عظیم الشان فاتح کے حالات کا بڑے شوق سے جس نہج جس کی کامیابی ویسی ہی سریع و یقینی تھی جیسی سکندر اعظم و تیمور کی۔

اور سرکار انگریزی کا تردد کچھ بجا بھی نہ تھا۔ نیپولین کی اولوالعزمی کی کوئی حد نہ تھی۔ ایک وقت تو اس نے یہ ارادہ ہی کر لیا تھا کہ ہندوستان میں فرانسیسی شاہنشاہی کی تجویز کو پھر عمل میں لائے جو اس سے قبل مشہور ڈوپلے کے زمانے ہی میں قائم ہو چکی ہوئی اگر اس کا احسان فراموش ملک بجائے تائید دینے کے اس سے کنارہ کشی اختیار نہ کرتا۔ ۱۸۱۹ء میں اس خواب کی تعبیر بے پورا ہو۔ نے کا وقت گزر چکا تھا اور نیپولین کا یہ ارادہ کہ ایران کو محفوظ مرکز قرار دیکے کابل و لاہور کو یکے بعد دیگرے تسخیر کرے اُس کی قوت کے باہر تھا۔ لیکن اس کے ارادے کی اطلاع یابی نے انگریزوں کو بے چین کر دیا اور اس کے ٹوڑ کے لیے مسٹر الفسٹن کو کابل اور مسٹر سی۔ ٹی بٹکاف کو رنجیت سنگھ کے دربار میں معاہدات کرنے کے لیے روانہ کیا گیا۔

ہمارا راجہ بڑا ہوشیار تھا۔ وہ انگریزوں کی اس سرسبکی سے آگاہ تو ہو گیا لیکن اُس کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ اس سے کسی قسم کا فائدہ اٹھا سکتا۔ وہ اپنے آپ کو محفوظ نہ پاتا تھا۔ انگریز اس کے تسلیم اس بارے کہ حملہ کرنے کی وجہ سے اس سے ناراض ہو گئے تھے۔ شمال کی جانب سے افغانوں کے حملہ کرنے کا خدشہ ہر وقت لگا ہوا تھا۔ پنجاب خاص کے سکھ امرا اپنی ہٹ پر قائم تھے اور

اور اس کی جانب سے ان کے دلوں میں شک پیدا ہو گیا تھا۔ جن لوگوں کو اس نے مغلوب کیا تھا وہ بدلہ لینے کے لیے بے چین تھے اور جن پر اب تک اس نے حملہ نہیں کیا تھا وہ اس کی دغا بازی اور ظلم سے ترساں تھے۔ اسی کے ساتھ اس کی یہ تجویز کہ ستلج اس پار کی تمام ریاستوں کو وہ اپنا محکوم بنا کر ایک بڑی سلطنت قائم کر لے جس میں خالصہ کے تمام سپوت شامل ہوں ہمیشہ اس کے پیش نظر تھی اور اس کی تکمیل کی معقول امید بھی اُس کو تھی۔ اس کے ستلج اس پار کے تین ہاٹ نے اس پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ پھلکیان کے راجہ اور مالوے کے سردار کس درجہ کمزور ہیں اور ان میں باہم اس درجہ نفاق ہے کہ اس کے مقابلے میں وہ متحد نہیں ہو سکتے اور ادھر انگریزوں نے اس وقت تک براہ راست کوئی مداخلت نہیں کی بلکہ دہلی جا کر جن لوگوں نے حفاظت طلب کی تھی انھیں بھی بلطائف الہیل ٹال دیا گیا تھا۔ انگریزی سفر کے وسط ماہ اگست میں کرنال سے روانہ ہو کر وہاں آنے کی خبر نے رنجیت سنگھ کو گونہ مشدد کر دیا لیکن شرائط کے طے ہونے سے پہلے اس نے اپنی حالت کو مستحکم کرنے کا تمام ارادہ کر لیا ستلج اس پار کے تینے کی تیاری کے لیے اس نے قصور میں فوج کشی شروع کر دی۔ مٹشکاف ۱۱ ستمبر کو پٹیا لے ہوتا ہوا دہلی پہنچا۔ پٹیا لے پہنچنے پر راجہ نے دوبارہ حفاظت کی استدعا کی اور اس قدر ترغیب فرماتے کی سعی کی کہ وہ شہر کی کنبیاں اس کے حوالے کر دینا چاہتا تھا تاکہ اور وہ سرکار انگریزی کی طرف سے پھر اسے واپس کر دے۔

مٹشکاف نے بلا کسی پس و پیش مہاراجہ کے روبرو ان تجاویز کو پیش کیا جن کے لیے سرکار کی جانب سے وہ روانہ کیا گیا تھا یعنی یہ کہ فرانسیسیوں کے مقابلے میں مدافعانہ اور جارحانہ صورتوں میں معاہدہ کیا جائے۔ کیونکہ حملہ ہونے کی صورت میں سرکار انگریزی اور ریاست لاہور دونوں کا مدافعت میں فائدہ تھا۔ مہاراجہ نے بخوشی خاطر اس تجویز کو قبول کر لیا لیکن اس کے معاوضے میں اس نے یہ چاہا کہ تمام سکھ ریاستوں اور سکھ قوم پر اس کی حکومت تسلیم کی جائے مٹشکاف اس کے ادا کے قبول کرنے کا مجاز نہ تھا اور چونکہ اس نے کلکتے سے آتمناج کی صورت میں بھی کامیابی کی توقع ظاہر نہیں کی اس لیے رنجیت سنگھ اس مقام سے

کوچ کر کے ستلج کے اُس پار چلا گیا۔ سفیر اگرچہ اس بدخلقی سے ناخوش ہوا لیکن اسے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ اسی کے ساتھ ساتھ وہ بھی روانہ ہو جائے۔ کھٹی سے فرید کوٹ جانا ہوا اور یہاں زبردستی قبضہ کر لیا گیا۔ فرید کوٹ سے مالیر کو ٹلہ پہنچ کر خراج کی وافر رقم طلب کی گئی۔ مشرٹکاف ہمارا جہ کے لشکر کے ساتھ ساتھ رہا۔ سفیر صرف اس وقت اس سے علیحدہ ہوا جبکہ ہمارا جہ نے ابنالے جانے کی تجویز کی جو ان ریاستوں کے عین قلب میں واقع تھا جنہوں نے سرکار انگریزی سے حفاظت کی استدعا کی تھی۔ یہاں سے علیحدہ ہو کر سفیر فتح آباد روانہ ہو گیا۔ شکاف نے جو سودہ معاہدے کا رنجیت سنگھ کے رد برویش کیا تھا وہ صرف فرانسیسیوں کے مقابلے میں اتحاد کرنے کے متعلق تھا۔ بخلاف اس کے رنجیت سنگھ نے جو مطالبہ کیا تھا وہ صرف یہ نہ تھا کہ انگلستان کے ساتھ قطعی اتحاد ہو جائے اُس سے اور کابل سے تنازع ہو تو کسی قسم کی مداخلت نہ ہو اور ستلج کے شمال و جنوب کے سکھ ممالک میں اس کی بلا شرکت غیر حکومت تسلیم کر لی جائے۔

ہمارا جہ کی پالیسی دانشمندانہ اور جبری تھی اور وہ اُس قسم کی کامیابی کا مستحق تھا جو اُس کو غالباً حاصل ہو جاتی خواہ فرانسیسی حملے کا اندیشہ واقعی ہوتا نہ کہ محض خیالی۔ اسے فرانس کی پروا نہ تھی اور وہ یہ جانتا تھا کہ نپولین اس کا دشمن نہیں ہے بلکہ انگریزوں کا حریف ہے۔ اگر انگریز فرانسیسیوں کے خلاف اسے اپنا شریک کرنا چاہتے ہیں تو انھیں اس کا معاوضہ دینا چاہیئے اس لئے اس نے اپنے مطالبات سفیر اور گورنر جنرل کے رد برو باصرار تمام پیش کیئے۔ معاہدے کے دوران تصفیہ میں ستلج اس پار کا جس قدر حصہ اسے مل سکا اس پر اس نے بجز قبضہ کر لیا تاکہ معاہدے کے تصفیہ پر خواہ اس کا انجام کچھ ہی کیوں نہ ہو جو ملک اس کے تصرف میں آجائے اس پر قبضہ بحال رہے اس نے بڑی دانشمندی سے سفر کو اپنے لشکر میں روکے رکھا تاکہ سرداروں کی مزاحمت قوت نہ پکڑ سکے اور اس کی کارروائی ایک طور سے سرکاری منظور شدہ تسلیم کی جائے۔

مشرٹکاف کے لشکر سے چلے جانے کے بعد ہمارا جہ نے فتح ممالک کا سلسلہ جاری رکھا اس نے شاہ آباد اور ابنالے پر قبضہ کر لیا اور پٹیلے کو بھی اپنے

دست تصرف میں لے آتا لیکن اسے اندیشہ تھا کہ اس کارروائی سے صرفاً انگریزوں کے ساتھ نقص عہد ہوگا اس لیے اس نے صرف اس امر پر اکتفا کیا کہ راجہ صاحب سنگھ کو جو پہلے ہی سے خائف ہو رہا تھا اپنے لشکر میں طلب کیا اور اس کے ساتھ بگڑی بدل کر ہمیشہ بھائی چارہ قائم رکھنے کی قسم کھائی۔ اس کے بعد وہ امرتسر واپس چلا گیا۔ یہاں پر انگریزی سفیر اربوڈ سمبر کو اس کے پاس پہنچ گئے۔

اسی اثناء میں کلکتے سے ہدایات وصول ہو گئیں۔ فرانسیسیوں کے حملہ کرنے کے عدم امکان کا تقریباً یقین ہوتا جاتا تھا۔ اور ایسے دہمی اندیشے کے مقابلے میں رنجیت سنگھ سے معاہدہ کرنا بے سود سمجھا گیا۔ بہ طور کم از کم ایسی رعایت کے قابل نہ تھا کہ ایسے قوی اور بے اصول فرماں روا کو ان ریاستوں پر اقتدار عطا کیا جائے جو اس سے متنفر اور سرکار انگریزی کے زیر حفاظت آنے کی خواہشمند تھیں۔ رنجیت سنگھ کو مطلع کیا گیا کہ گورنر جنرل کو اس کے ستلج کے جنوب کے ممالک میں رسوخ پیدا کرنے کے باطل دعوے کا حال معلوم ہو کر سخت تعجب و تعلق خاطر ہے اور اس سے زیادہ استعجاب اس امر پر ہے کہ وہ اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لیے سرکار انگریزی کی امداد کا خواہاں ہے۔ اسے یہ بھی اطلاع دی گئی کہ سرکار انگریزی دراصل مرہٹوں کی جنھیں اس نے شکست دی جا نہیں ہے اور لڑائی کے زمانے میں خود مہاراجہ نے ستلج کو حد فاصل قرار دینے کی صلاح دی تھی۔ اس زمانے سے سرکار نے ستلج اس پار کے سرداروں کو تمام قسم کے خراجوں سے بری کر دیا۔ ان کا کسی کا محکوم ہونا گوارا نہ کیا اور انھیں اپنی حفاظت میں بالکلیتہ لے لیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ مہاراجہ کا سفیر کے ساتھ برتاؤ خلاف اخلاق تھا اور یہ کہ جبکہ گورنر جنرل سے استخراج کیا گیا تھا تو ایسے موقع پر اس کا ستلج اس پار کے ملک پر حملہ کرنا خلاف آداب تھا مہاراجہ سے مطالبہ کیا گیا کہ ستلج کے جنوب کا جس قدر ملک سرکار انگریزی سے معاملہ رجوع کیے جانے کے بعد فتح کیا گیا ہے وہ واپس کر دیا جائے اور سکھ فوج دریا کے شمال کی جانب واپس طلب کر لی جائے۔

مہاراجہ کو ان شرائط کے متعلق سخت شکایت تھی اور ان کی تعمیل سے پہلو پتی کرنے کی کوشش بیکار تھی۔ اس نے اس کا جواب یہ دیا کہ سفر اتو فرانس کے مقابلے

میں معاہدہ کرنے اور اس کے ساتھ دوامی اتحاد کے استحکام کی غرض سے بھیجے گئے تھے لیکن معاہدہ بالکل فراموش کر دیا گیا اور صرف دوستی کا اظہار اس طور پر کیا گیا کہ اسکی دیرینہ آرزو کے برآئے میں رخنہ اندازی کی گئی۔ وہ اس درجہ ناخوش ہوا کہ لڑائی کیلئے آمادہ ہو گیا۔ فوج اور سامان جنگ ہر طرف سے اکٹھے کیئے گئے اور امرتسر کے جدید قلعہ گوہن گڑھ میں فوج و رسد لڑائی کے لئے مہیا کی گئی۔ جنرل کمپچند جو سکھوں کا بہترین جنرل اور انگریزوں کا سخت دشمن تھا کانگڑے سے واپس طلب کر کے ستلج پر بھٹنور کی طرف جو لدھیانے کے محاذ میں ہتھیار روانہ کیا گیا۔ جہاں پہنچکر اس نے اپنا پڑاؤ ڈال دیا۔ اس خاصمانہ نقل و حرکت کا جواب انگریزوں نے یہ دیا کہ کرنل اختر لونی کے ہمراہ لدھیانے پر ایک فوج روانہ کر دی اختر لونی جب پٹیالے اور نابھے میں سے ہو کر گزرا تو لوگوں نے اُس کا استقبال بہت کچھ اظہار مسرت و اطمینان سے کیا۔ اس اثناء میں لاہور میں معاملات کے تصفیے میں تعویق ہونے لگی۔ سفیر کو یہ باور کرایا گیا کہ مہاراجہ کا ستلج پر اپنے لشکر میں آکر شامل ہونے سے یہ مقصود ہے کہ جنگ شروع کر دی جائے۔ اور سفیر نے سپہ سالار کو یہ مشورہ دیا کہ پنجاب پر حملہ کیا جائے کیونکہ صرف اس طریقے پر اس ناقابل برداشت حالت کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ آخر مہاراجہ کے مشیروں کی صلاح نیک کار گر ہوئی۔ اور اب اس کو یہ معلوم ہو گیا کہ مزید مزاحمت بے سود ہے۔ ۱۲ اپریل ۱۸۵۹ء کو اس نے فریڈ کوٹ کو خالی کر دیا اور انبالے کی فوج ستلج کے شمال کی جانب ہٹائی۔ اب معاہدے کی تکمیل کے لئے کوئی وقت باقی نہیں رہی اور ۲۵ اپریل کو اس کی تکمیل ہو گئی اور ۳۰ مئی کو گورنر جنرل نے اس پر دستخط کر دیئے۔ اس معاہدے کی رو سے سرکار انگریزی نے ستلج کے شمال کی جانب مہاراجہ کے ملک و رعایا کے بارے میں مداخلت کرنے سے احتراز کرنے کا وعدہ کیا اور مہاراجہ نے یہ اقرار کیا کہ دریا کے جنوبی قلعہ ملک کے سرداروں کے مقبوضات تسلیم کیئے جائیں گے۔ ان سرداروں کے بارے میں یہ اعلان بطور تکملہ شایع ہوا کہ سرکار انگریزی نے انھیں اپنے حفاظت میں لے لیا ہے۔ ان کے حقوق و اقتدار میں کوئی مداخلت نہ کی جائیگی اور نہ ان سے کسی قسم کا خارج لیا جائیگا اس شرط پر کہ جب کوئی ایسا دشمن برسرِ مقابلہ ہو جو ان کا اور سرکار انگریزی دونوں کا دشمن

ہو تو امداد و معاونت اُن کا فرض ہو گا۔

اس وقت سے لیکر پہلی سکھوں کی لڑائی کے وقت تک ستلج اُس پار کی تاریخ لاہور کی تاریخ سے بالکل علیحدہ رہی۔ ہمارا جہ نہایت ایمانداری سے اپنے اقدار پر قائم رہا اور یہ سمجھ کے کہ انگریزوں کی قوت زبردست ہے اس نے ہمیشہ کئے لئے ستلج اس پار کے ممالک پر اقتدار حاصل کرنے کے منصوبے کو ترک کیا اور اپنی توجہ افغانوں کو صوبے کے شمالی اضلاع سے خالیج کرنے اور ملتان۔ کشمیر و ڈیرہ جات کو مسخر کرنے کی جانب مبذول کی۔ یہ امر متنبہ ہے کہ ۱۸۱۷ء کے اوائل میں آیا و حقیقت وہ آمادہ جنگ ہوا تھا۔ مسٹر سٹکاف کا خیال تو یہ ہے کہ وہ حقیقتہً آمادہ ہوا تھا لیکن اس زمانے میں ہمارا جہ کی فراست و عیاری کا کما حقہ علم نہ تھا یہ ممکن ہے کہ وہ شروع سے لیکر آخر تک محض دھمکانے کی غرض سے یہ چال چلا ہوتا کہ سرکار انگریزی کسی طرح اپنے بعض مطالبات سے دست بردار ہو جائے۔ اس ترکیب میں کسی حد تک تو اسے کامیابی حاصل ہو گئی کیونکہ اسے صرف ستلج اس پار کے اضلاع واپس دینے پر مجبور کیا گیا۔ جن پر اس نے اپنی آخری لشکر کشی کے بعد قبضہ کیا تھا۔ اس کے قبل چند سال پیشتر کی لڑائی میں جو ملک اس کے قبضے میں آئے یا اس نے سرداروں کو دیدیئے تھے وہ چھوڑ دیئے گئے گواہی یہ اجازت نہیں دی گئی کہ ستلج اس پار کے ان سرداروں سے جنہیں اس نے خود ممالک عطا کیئے تھے کسی قسم کی اطاعت کا دعویدار ہو۔

باب دہم

مابعد کی فتوحات

اس باب میں اختصار کے ساتھ یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ مہاراجہ کو اپنے حریف مسلمانوں اور دوسرے دشمنوں پر کون کون سی فتوحات حاصل ہوئیں۔ شمالی وسطی اضلاع میں اسنے اسلامی اقوام کو کس طرح مغلوب کیا اور ملتان کشمیر پشاور اور ڈیرہ جات پر کس طرح اس کا قبضہ ہوا۔ ملتان کے قدیم شہر ضلع میں شاہی نسل کا ایک افغانی خاندان حکمران تھا جو ۱۷۳۸ء میں نادر شاہ کے حملے کے وقت نواب کی حیثیت سے مامور کئے گئے تھے جو مکر مغلوں کی حکومت کی مجموعی طاقت میں انحطاط آچلا تھا اس لیے وہ اس امر کی خواہشمند تھی کہ مرکزی حکومت شکست کر کے ان دور دراز ممالک کو مستحکم کرے جن کو اپنے قابو میں رکھنا اس کے لیے ناممکن ہو گیا تھا ۱۷۴۷ء و ۱۷۴۸ء کے مابین اس شہر پر تھوٹی تھوٹی مدت کے سوا بھنگی سرداروں کا قبضہ رہا اور بالآخر تیمور شاہ نے انھیں نکال باہر کیا اور ۱۷۴۹ء میں مظفر خاں یہاں کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ شیخ شخص بہت جبری و مستبد تھا اور اسنے ساکھوں اور ہم سایہ اقوام سیال وغیرہ کا جو اس پر حملہ آور ہوئے تھے بڑی بہادری سے مقابلہ کر کے اپنی حکومت قائم رکھی۔ ۱۷۵۷ء میں مظفر خاں نے نوجوان رنجیت سنگھ کو پہلی مرتبہ دیکھا جبکہ وہ لاہور سے ملک کی خفیہ دیکھ بھال کے لیے آیا تھا۔ نواب نے شہر سے ۳۰ میل چل کر ملاقات کی اور دونوں سردار باہم ایک دوسرے کو تحائف دیکر صلح و محبت کے ساتھ جدا ہوئے۔ اس کے بعد ۱۷۵۷ء میں جھنگ کو مغلوب کر دینے

۱۔ مہاراجہ کے ملتان کی لڑائیوں کے پورے حالات سدوزئی کے سرداران ملتان اور دیوان ساون مل کی سوانح عمریوں کے صفحات ۴۷۵ - ۴۸۹ اور ۲۷۲ - ۲۸۵ میں نیز سرداران پنجاب و حالات محاربہ کشمیر میں درج مرقوم ہے چند کے صفحات ۵۵۱ - ۵۶۰ درج ہیں۔

بعد رنجیت سنگھ ملتان کی جانب روانہ ہوا اور شہر کے شمال میں ۲۰ میل کے فاصلے پر مہتمم کے مقام پر خیمہ زن ہوا۔ نواب کو اس وقت لڑنا منظور نہ تھا اس لئے اس نے ستر ہزار روپے دیکر اسے رخصت کر دیا۔ دوسرے سال اس کی آتش حرص پھر بھڑک اٹھی اور چونکہ پہلی مرتبہ اسے باسانی رقم ہاتھ لگ گئی تھی اس لئے اس نے ملتان پر کثیر فوج کے ساتھ دھاوا کر دیا۔ شہر کے ایک حصے پر قبضہ کر لیا گیا لیکن قلعے پر فتح پانے کے لئے سکھ فوج کی تمام کوششیں رائیگاں گئی۔ سردار فتح سنگھ کلیان والہ کے ذریعے سے ایک مسابدہ کیا گیا جس کے رو سے رقم کثیر وصول ہونے پر مہاراجہ واپس چلا گیا۔ نواب مظفر خاں نے لڑائی سے تنگ آ کر گئے کا سفر کیا اور واپس آنے پر اس امر کی کوشش کی کہ انگریز اسے اپنی پناہ میں لے لیں۔ مگر بے سود ہوئی انگریزوں نے انکار کیا۔ کیونکہ ملتان دور تھا اس وقت جس حصہ ملک پر وہ اپنا اقتدار قائم رکھنا چاہتے تھے اس حلقے سے وہ باہر تھانے۔

سنہ ۱۸۱۷ء کے اوائل میں رنجیت سنگھ نے پھر ملتان پر چڑھائی کی۔ اس کے ذرا پہلے ہی خوشاب پر اس کی ملاقات شاہ شجاع سے ہوئی اور جلاوطن حکمران نے سکھوں سے یہ استدعا کی کہ وہ ملتان اپنے قبضے میں لیکر اس کے حوالے کر دیں۔ سنہ ۱۸۱۷ء میں مظفر خاں نے شاہ شجاع کی فوج کو پسپا کر دیا تھا تا لیف قلوب کے لئے متعدد بار اس نے ملتان میں سکونت کرنے کی اس سے خواہش کی بھی لیکن شاہ شجاع کو یہی دھن لگی رہی کہ شہر و ملک کو فتح کر کے اس کو اپنا بنالے۔ رنجیت سنگھ نے اس کمزور طبیعت کے بادشاہ کی بڑی آغوش بھگت کی لیکن جب اس سے کچھ رقم پلے نہ پڑی تو اس نے بطور خود ملتان پر قبضہ حاصل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ۲۴ فروری سنہ ۱۸۱۷ء کو وہ شہر پناہ تک پہنچ گیا اور اس کے دوسرے روز شہر پر قبضہ کر لیا۔

کچھ عرصے تک قلعے پر بے سود گولہ باری ہوتی رہی اس کے بعد سرنگ لگائی گئی لیکن محصورین نے کامیابی کے ساتھ سرنگ کو اڑا دیا جس سے عطر سنگھ کا توپ خانہ اڑ گیا اور عطر سنگھ اور اس کے بارہ آدمی ہلاک ہو گئے ۱۲ مارچ کو پھر جمع ہو کر یکبارگی دھاوا کیا گیا لیکن سکھوں کو نقصان عظیم کے ساتھ پسپا ہونا پڑا۔ لشکر میں اب رسد کی قلت ہو گئی تھی اور سکھوں میں بد دلی پھیل گئی۔ دیوان مکھن چند ان کا

۲۵ سالار سخت علیل تھا۔ بہت سے سردار مارے گئے تھے اور قلعے کی ایک اینٹ تک نہ اکھڑی تھی۔ ۲۵ مارچ کو دوسرا دھاوا کیا گیا لیکن اس کا بھی وہی حشر ہوا اس لیے مجبوراً محاصرہ برخاست کرنا پڑا اور رنجیت سنگھ کو یہ ذلت نصیب ہوئی کہ مظفر خاں کی سابقہ پیش کردہ شرائط جن کے قبول کرنے سے وہ پہلے انکار کر چکا تھا اب اسے ان پر رضامند ہونا پڑا۔ شرائط یہ تھے کہ ڈھائی لاکھ نقد - ۲۰ جنگی گھوڑے اور بوقت جنگ امداد دی جائے۔ مہاراجہ ۳۰ ہزار روپے بطور بیعانہ تاوان وصول کر کے ۱۴ اپریل کو ملتان سے روانہ ہو گیا۔

رنجیت سنگھ نے یہ دیکھ کر کہ اس میں تنہا اتنی قوت نہیں کہ ملتان پر فتح پاسکے گورنر جنرل سے انگریزی فوج بھیج کر کمک دینے کی درخواست کی۔ اس کی اس تحریک پر التفات نہ کیا گیا۔ زیادہ تر اس وجہ سے کہ اس نے یہ بھی تحریک کی کہ بجائے اس کے کہ فوج پنجاب میں سے ہو کر گزرے تلج کے جنوبی دیران قطع ملک میں سے ہو کر جائے۔ شاہ شجاع نے بھی بطور خود ملتان پر دھاوا کرنے کی تیاری کی لیکن اس میں اتنی سمجھ تھی کہ وہ اس ہم سے جس میں اسے کامیابی کی کوئی توقع نہ تھی باز رہا۔

فروری ۱۸۱۷ء میں ایک بے قاعدہ حملہ سکھوں نے ملتان پر کیا۔ بھاو پور و ملتان پر ایک دستہ فوج کا خراج وصول کرنے کے لیے روانہ کیا گیا تھا۔ مظفر خاں کو خراج ادا کرنے میں کچھ دیر لگی تو پھولا سنگھ اکالی نے بھنگ سے بدست ہو کر دیوانہ وار فدا یوں کی ایک جماعت کے ساتھ شہر پر دھاوا کر دیا اور اس زور شور سے حملہ کیا کہ قلعے کی بالائی فصیل کے ایک حصے پر قابض ہو گیا۔ لیکن فقیر عزیز الدین نے مدد پر پیش کی جس پر مظفر الدین نے رقم خراج جلد ادا کر دی۔ ورنہ وہ اس قدر جلد ہرگز ادا نہ کرتا۔ سکھ فوج منکیرا کی جانب روانہ ہو گئی۔ ۱۸ء میں سکھ فوج سے دیوان چند کے زیر کمان ملتان کی جانب کوچ کر کے قلعے پر حملہ کیا لیکن لپٹا کر دی گئی دس ہزار روپے وصول کرنے کے بعد یہ لوگ واپس چلے گئے۔ یہ کارروائی دفع الوقتی کے طور پر کی گئی تھی۔ اس اثنا میں مہاراجہ ایک بڑی ہم کی تیاریاں کر رہا تھا اور اس نے قسم کھائی تھی کہ ملتان پر جہاں اسے متعدد بار نہایت نصیب ہوئی قبضہ حاصل کر کے رہیگا۔ ۱۸ء کے موسم سرما میں اس نے ہر طرف سے فوج درسد جمع کرنا شروع کی اور جنوری ۱۸۱۸ء کو

اٹھارہ ہزار سپاہیوں کی فوج لاہور سے روانہ ہوئی جس کی سرکردگی برائے نام شہزادہ کھڑک سنگھ کے حوالے تھی لیکن دراصل شہزادہ چاند پتہ سالار تھا۔ ملتان جاتے وقت راستے میں خان گڑھ مظفر گڑھ کے قلعوں پر قبضہ کیا گیا۔ اوائل فروری میں شہر کا محاصرہ کر کے قبضہ کیا اور قلعے پر گولہ باری شروع کی گئی۔ نواب کے پاس صرف دو ہزار آدمی تھے اور قلعے میں محاصرہ برداشت کرنے کے لیے لڑائی کا سامان اور رسد موجود نہ تھی لیکن پھر بھی اس نے ایسی بہادری سے مقابلہ کیا کہ اس سے قبل سکھوں کو کبھی ایسا موقع پیش نہ آیا تھا؛

۲ جون تک گولہ باری ہوتی رہی۔ دیوار میں آخر دو شگاف پڑ گئے کیونکہ احمد شاہ والی توپ زمزمہ جو بھنگیوں کے پاس تھی لاہور سے ساتھ لائی گئی تھی اور چار مرتبہ اس کو کامیابی کے ساتھ سر کیا تھا۔ سکھوں نے کئی بار حملے کیے لیکن ہر بار وہ پسپا کر دیئے گئے۔ ایک مرتبہ تو ان کے ۸۰۰ آدمی ضائع گئے۔ قلعے کا دروازہ اڑا دیا گیا لیکن قلعے کے اندر کی فوج نے ان کے رو برو دھس بنا کر سکھوں سے دست بدست لڑائی کی قلعے کی مدافعت کرنے والوں کی تعداد گھٹتے گھٹتے اب دو تین سو رہ گئی جس میں سے اکثر تو مظفر خاں کے قبیلے یا خاندان کے تھے باقی یا تو ہلاک ہو گئے یا دشمن سے جا ملے کیونکہ انھیں اپنے آقا کا ساتھ چھوڑنے کے لیے بہت کچھ رشوت دی گئی تھی؛

بالآخر ۲ جون کو ایک اکالی نے جس کا نام سادھو سنگھ تھا یہ ارادہ کر کے کہ ۱۷ء میں پھولانگھ نے جو کام انجام دیا تھا اس پر فوقیت لے جائے اپنے چند جبری رفقا کے ساتھ قلعے کی فصیل پر حملہ کر کے افغانوں کو اچانک جالیا اور وہ اس پر قابض ہو گیا سکھ فوج ایسی کامیابی کو دیکھ کر دھاوے میں شریک ہو گئی اور خضری دروازے کے شگاف تک جا پہنچی۔ یہاں بڑھا نواب مع اپنے آٹھوں بیٹوں اور پیمانہ فوج کے تلوار ہاتھ میں لڑنے لگا اور مرتے دم تک مقابلے کے لیے آمادہ تھا۔ افغان کی تیغ براں کی زد نے کشتوں کا ڈھیر لگا دیا۔ سکھوں نے پیچھے ہٹ کر اپنی توپ باریاں بند توپوں سے باڑ مارنا شروع کیا۔ افغان سردار نے لٹکار کر کہا۔ ”مردوں کی طرح سامنے آ کر لڑو“ لیکن بھلا سکھ اس دعوت کو کب قبول کرنے والے تھے۔ اس طے پر

پیر سفید ریش مظفر خاں نے پناہ مانگنے سے منکر کرتے ہوئے اپنے پانچ بیٹوں سمیت داعی اجل کو لبیک کہا۔ چھٹے لڑکے کے چہرے پر سخت زخم آیا باقی دو نے امان طلب کر لی اور بچ گئے۔ محصور فوج میں سے بھی صرف چند ہی آدمیوں کی جان بچی اور تمام شہر میں لوٹ مار مچ گئی۔ قلعہ شجاع آباد بھی مسخر کر لیا گیا اور اس میں سے پانچ توپیں لے لی گئیں۔ بعد ازاں ملتان کے شہر پناہ کی مرمت کی گئی۔ ۶۰۰ سو سپاہی قلعے پر تعین کیئے گئے اور سکھ فوج لاہور واپس چلی گئی۔ مشہور یہ تھا کہ ملتان میں بہت دولت ہے۔ مہاراجہ کو صرف دو لاکھ روپے کا حصہ لوٹ میں ملا۔ اس لئے اس نے یہ حکم دیا کہ تمام عہدہ دار اور سپاہی مال غنیمت واپس کر دیں ورنہ ایک تاریخ معینہ تک واپس نہ کیا گیا اور اس کے بعد بھی ان کے قبضے میں رہا تو اس کی سزا موت ہے۔ اس حکم سے ۵ لاکھ ریاست کے خزانے میں اور داخل ہوئے لیکن ملتان کی غنیمت کا اندازہ ۲۰ لاکھ کیا جاتا ہے۔ عام لوگوں کا خیال یہ تھا کہ جس کے پاس اس لوٹ کا مال تھا وہ اسے راس نہ آیا۔ بہت سے ایسے لوگ یا محتاج مرے یا لڑائی میں مارے گئے۔

دوسرے سال ۱۸۱۹ء کے موسم بہار میں مہاراجہ نے کشمیر کو اپنے ملک میں شامل کر لیا۔ ایک عرصے سے اس ملک پر اس کا دانت تھا اور متعدد بار اس پر حملے بھی کیئے گئے مگر بے سود ہوئے تھے۔ اس کی فتح سے اس کے مقبوضات کی مقدار دو گنی ہو گئی۔ پہاڑیوں اور وادیوں کا یہ عجیب و غریب خفا قلعہ ملک جو جموں اور پنجاب کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے سلسلے سے آغاز ہو کر اس بڑے پہاڑ تک پہنچتا ہے جس کی بلندی آلبس سے دو گنی ہے اور جہاں ہمیشہ برف جمی رہتی ہے صدیوں سے مختلف فاتحین کا انعام فتحیابی رہا ہے خصوصاً اس کی قدرو منزلت اس لئے ہوتی رہی کہ یہ موسم گرا کے لئے ایک خوشگوار مقام ہے جبکہ ہندوستان کی سر زمین دوزخ کا نمونہ

۵۱۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے مارکرافٹ سے جو ایک سیاح تھا یہ بیان کیا تھا کہ پانچ سو فوج باقی بھی تھی جسے امان دی گئی۔ لیکن یہ بیان صحیح نہیں ہے حملے کے وقت قلعے میں صرف ۳۰۰ سے زائد لڑنے والے نہ تھے اور ان میں سے بھی بہت سے تفصیل کے شکاف میں لڑتے ہوئے مر گئے تھے۔
۵۲۔ سردار ان پنجاب صفحہ ۴۸۷

بن جاتی ہے۔ جو لوگ شمالی جانب سے حملہ آور ہوتے رہے انھیں اپنے وطن طہران
دکابل کی غنکی اور خوشنائی کی یاد ہمیشہ ستاتی رہی اور اس یاد کو وہ کشمیر رہ کر پورا کیا کرتے تھے؛
تیرھویں صدی کے آغاز تک کشمیر میں ہندو راجاؤں کی حکومت رہی اس کے
بعد ۱۰ سال تک مسلمان خاندان فرمانروا رہا۔ متعدد ناکامیاب مہمات کے بعد
۱۱۰۰ء میں اکبر اعظم نے یہاں مغلوں کی حکومت قائم کی جو ڈیڑھ صدی تک قائم رہی۔
یہی زمانہ تھا کہ منجلہ دوسری پہاڑی اقطاع عالم کے کشمیر کی شہرت اپنی خوشنائی کی وجہ
سے تمام دنیا میں پھیل گئی۔ ذی اقتدار شہنشاہ جو اس زمانے کے یورپ کے حکمرانوں
سے کہیں زیادہ متمول اور عیش پسند تھے۔ اور نگ زیب۔ اکبر۔ جہاں گیر شاہ جہاں
سال بہ سال اس کی خوشنوا دیووں میں پہنچا کرتے تھے اور اپنے تمام دربار کو ہمراہ
لیجاتے تھے۔ اس تمام قافلے کی سربراہی میں ملک کی تمام آمدنی صرف ہو جاتی تھی۔
کشمیر میں انھوں نے محلات اور فریج گاہیں بنائی تھیں ان میں سے بعض اب تک موجود ہیں
جن سے ان بادشاہوں کی شان و شوکت اور خود غرضی کا ثبوت ملتا ہے جنھوں نے
رعایا سے تو اس قدر متع حاصل کیا لیکن اس کا بدلہ بہت کم دیا؛

مغلوں کا خاندان گزر گیا تو اس کے جانشین افغان ہوئے جنھوں نے احمد شاہ
درانی کی سرکردگی میں ۱۷۵۷ء میں کشمیر فتح کر کے اس پر حکومت کی۔ اس کی اور اس کے
جانشینوں کی حکومت اس درجہ جاہلانہ اور ظالمانہ تھی کہ مغلوں کی حکومت اس کے
مقابلے میں رحمت معلوم ہوتی تھی۔ ۱۷۷۰ سال بعد سکھ اس قطعہ ملک کے حاکم بن گئے
اور ان کے بعد یہ ملک راجپوتوں کے ہاتھ لگا۔ جنوں کے راجہ گلاب سنگھ کو جو
رنجیت سنگھ کا ملازم و مشیر تھا کشمیر اور اس کے مضافات کی حکومت انگریزوں کی
جانب سے ۱۸۱۹ء میں دی گئی؛

یہ یاد رہے کہ جنوں کا تعلق سکریچا کیا خاندان کی قسمت کے ساتھ وابستہ تھا۔
ہمارا راجہ کے باپ نے اس شہر کو جو اس وقت اس کے نصیب رفیق راجہ برج لال دیو کے قبضے
میں تھا لوٹ کر غارت کر دیا تھا۔ اس زمانے میں جنوں کا کوئی تعلق کشمیر سے نہ تھا۔
کئی ہزار سال سے یہاں کی حکومت راجپوت نسل کے ہندو خاندان میں چسلی
آ رہی تھی۔ اور اگرچہ یہ منسل بادشاہوں کا خراج گزار تھا لیکن ان کی سلطنت کے

انحطاط کے وقت اس نے ان کی حکومت سے سبکدوشی حاصل کر لی اور تھوڑے عرصے تک اس آزادی کو برقرار رکھا لیکن سکھوں کی روز افزوں قوت نے اسے مغلوب کر دیا۔ سب سے پہلے بھنگی سرداروں نے اس پر چھا پامارا اور راجہ رنجیت دیو ان کو خراج دینے پر مجبور ہوا اور اس کے بعد سکھ چاکیا والوں نے جہان سنگھ کی سرکردگی میں اس کو لوٹا۔ رنجیت دیو کا نام اب تک پہاڑی قطعات ملک میں عزت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ وہ نصف مزاج اور غیر متعصب انتظم تھا اور یہ امر اس کی رعایا کی بدقسمتی پر محمول کیا جاتا ہے کہ اس میں مدافعت کی اتنی قوت نہ تھی کہ سکھوں کے مطالبات سے انکار کرتا جو نئے مذہب کے جوش میں کٹر ہندوؤں کے ٹوٹنے میں بھی اسی قدر سرگرم تھے جس قدر وہ مسلمانوں سے متنفر تھے۔ تین بھائی راجگان گلاب سنگھ۔ دھیان سنگھ۔ سیمیت سنگھ۔ جو مہاراجہ کے آخری زمانے میں دربار لاہور کے ذی اقتدار اراکین تھے اسی خاندان کے تھے یا کم از کم انھوں نے اپنا شجرہ جو پیش کیا تھا اس سے یہ ان پڑھ فرمانروا مرعوب ہو گیا تھا۔ جموں کی وراثت کے متعلق ان کا حق مرجع سمجھا گیا۔ ان کے راجنسل سے ہونے یا نہ ہونے کے قطع نظر ذاتی اوصاف و فراست کے اعتبار سے یہ لوگ ممتاز تھے اور ایسے فرقے میں کامیابی کے زیادہ مستحق تھے جہاں اوصاف جبرہ حماقت اور صرف مکرو و غایقینی ذرائع کامیابی تھا پڑے۔

سالہ میں مہاراجہ نے کشمیر فتح کرنے کی تیاری کی اور پہلے بھمبر اور راجوری کی پہاڑی ریاستوں کو مغلوب کیا جہاں راجپوت نسل کے مسلمان خاندان حکمراں تھے اس کے بعد دوسرے سال کو لو کو مغلوب کیا بعد ازاں اس نے کابل کے شاہ محمود کے وزیر فتح خاں کے ساتھ اتحاد کیا جو کشمیر کی تسخیر اور وہاں کے صوبہ دار عطا محمد خاں کو شہر بدر کرنے کے ارادے سے دریاے سندھ کو عبور کر آیا تھا۔ یہ معاہدہ صرف اس لئے کیا گیا تھا کہ جب ایسا موقع جاتا رہے تو اس کو فتح کر دیا جائے۔ مہاراجہ اور فتح خاں دونوں کی نیت یہ تھی کہ جس قدر جلد موقع مل سکے ایک دوسرے کے ساتھ چال بازی کرے لیکن فی الوقت اس معاہدے کی ضرورت تھی کیونکہ دونوں میں کوئی ایک بھی دشمن کی فوج کو پیچھے چھوڑ کر پہاڑیوں میں سے گزر نہ سکتا تھا۔ ہنرل مکھ چند سکھ فوج کا سپہ سالار مقرر کیا گیا جس کو کشمیر کے

مال غنیمت میں سے ایک ٹلٹ دیئے جانے کا وعدہ کیا گیا۔ مکھم چند نے فتح خاں کے ساتھ جہلم سے کوچ کیا جب فتح خاں پہر پچال پہنچا تو اس نے یہ خیال کر کے کہ مہاراجہ کی عدم مداخلت کے بارے میں کافی احتیاط عمل میں آچکی ہے اپنی پہاڑی طاقتور فوج کے ساتھ کوچ پر کوچ کرنا شروع کیا اور مکھم چند کو اپنے ارادے سے بے خبر رکھا۔ سکے پہاڑوں میں سے کوچ کرنے کے کبھی عادی نہ تھے۔ اور برف باری کی وجہ سے وہ اور بھی بسرعت نہ چل سکے۔ دیوان مکھم چند فتح خاں کی نسبت سے واقف ہو گیا لیکن اس کی وجہ سے اپنے منصوبے سے باز نہ آیا۔ اس نے راجوری کے ایک سردار کو دھم ہزار روپے اس شرط سے دینے کا وعدہ کیا کہ وہ کوئی ایسا راستہ بتا دے جس پر سے ہو کر وہ فتح خاں کے پہنچنے والی وادی میں پہنچ جائے۔ وہ جو وہ سنگھ کلیسا اور نہال سنگھ اتاری اور ایک مختصر فوج کو ساتھ لیکر اس راستے پر روانہ ہوا۔ اور اپنے ارادے میں کامیاب ہوا۔ شیر گڑھ اور سہری بربت پر قبضہ کرنے اور وادی کی تسخیر کے عین موقع پر وہ جا پہنچا۔ وادی اور قلعے کی تسخیر کوئی دشوار امر نہ تھا کیونکہ صوبہ دار بھاگ گیا تھا۔ اور اور کسی قسم کی مزاحمت نہ ہوئی۔ لیکن مکھم چند کی فوج بہت مختصر تھی اور اس سے کوئی کام نہیں لیا جاسکتا تھا۔ فتح خاں نے اس امر کا اعلان کیا کہ سکھ مال غنیمت میں کوئی حصہ پانے کے مستحق نہیں ہیں تو

شاہ شجاع سابق فرمانروائے کابل جو کشمیر میں بطور قیدی رکھا گیا تھا دیوان مکھم چند کے حوالے کیا گیا جو اسے لاہور لے گیا۔ مہاراجہ یہ سن کر بہت ناراض ہوا کہ وزیر فتح خاں نے مال غنیمت میں حصہ دینے سے انکار کیا اور اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس سے اس کا بدلہ لے۔ اس نے کشمیر کے سابق صوبہ دار کے بھائی جہاندار خاں سے نامہ و پیغام شروع کیا جو اٹک کے قلعے پر قابض تھا جہاں سے وہ دریائے سندھ کے راستے کی نگرانی بخوبی کر سکتا تھا مہاراجہ نے جہاندار خاں کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ قلعہ سکھوں کے حوالے کر دیا جائے۔ اب فتح خاں کو ناخوش ہونے کی باری آئی اس نے قلعہ حوالے کر دینے کے لئے مطالبہ کیا لیکن زنجیت سنگھ نے کہلا بھیجا کہ جب تک کشمیر کے مال غنیمت کا حصہ اسے نہ دیا جائے گا اس وقت تک قلعہ حوالے نہیں کیا جاسکتا۔ اپریل ۱۸۱۹ء کو فتح خاں کشمیر سے روانہ ہوا اور اپنے بھائی عظیم خاں کو صوبہ دار مقرر کر گیا۔

اب اس نے اٹک کا محاصرہ کیا لاہور سے بے جلت ککب روانہ کی گئی اور پھر کچھ چاند سپلاہ بنایا گیا۔ عرصے تک فوجیں ایک دوسرے کے مقابل پڑاؤ ڈالے رہیں وقتاً فوقتاً جنگ ہوتی رہی جس میں سکھوں کا زیادہ نقصان ہوا۔ سکھ کھل کھلا ٹڈی بھڑکتے ڈرتے تھے۔ قلعے کے اندر کی تمام رسد ختم ہو گئی اور اس وقت اس امر کی ضرورت ہوئی کہ یا تو اس محصور فوج کی مدد کی جائے یا قلعہ بالکل دشمن کے حوالے کر دیا جائے کچھ چاند نے اب مقابلے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ حیدر دہر جو اٹک سے چند میل کے فاصلے پر تھا وہ مقابلے کے لیے صف آرا ہوا۔

روائی کا آغاز دوست محمد خاں جو بعد میں کابل کا مشہور فرمانروا ہوا۔ اس نے سواروں کا دستہ لیکے بڑی بہادری سے حملہ کیا جس سے سکھوں کا پراتوڑ دیا سکھوں کی فوج کے ایک بازو میں بالکل بظلمی پھیل گئی چند توپیں ہاتھ سے نکل گئیں۔ افغان یہ سمجھ کر کہ کامل فتح حاصل ہو گئی ہے لوٹ مار کرنے کے لیے منتشر ہو گئے۔ اس وقت دیوان کچھ چاند نے خود محفوظ فوج کی سرکردگی کر کے دشمن کو ہر مقام سے بڑے نقصان کے ساتھ پسپا کر دیا۔ فتح ناں اس سے قبل ہی بھاگ گیا تھا کیونکہ اسے یہ خیال ہو گیا تھا کہ دوست محمد خاں مارا گیا ہے۔ افغان فوج کابل کی جانب واپس گئی۔ جہاں پہنچ کر وزیر فتح محمد خاں نے ہرات پر فوج کشی کی تاکہ اٹک کی ناکامیابی کا دھبہ مٹائے۔ حیدر کو ۱۳ جولائی ۱۸۱۳ء کو سر ہوئی یہ پہلا موقع تھا کہ مہاراجہ نے افغانوں کا مقابلہ میدانِ مصافحہ میں کیا۔ اس کا نتیجہ اہم اور آئندہ کے لیے نہایت مفید ہوا۔ لیکن سکھوں کو جو اعتماد اس موقع پر اپنی ذات پر حاصل ہو گیا تھا اس سے وہ اگلے برس کی شکست سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اگلے سال رنجیت سنگھ نے یہ خیال کر کے کہ فتح خاں موجود نہیں اور افغان فوج درہم درہم ہے کشمیر و لسانی سے قبضہ ہو جائیگا۔ سیالکوٹ میں جموں کے نیچے میدان میں فوج کثیر فراہم کر کے وادی کی جانب کوچ کرنے کی تیاری کی۔ دیوان کچھ چاند سپہ سالار اعظم بیمار تھا اور چند ہی مہینوں کے بعد اس کا انتقال ہی ہو گیا۔ اس نے مہاراجہ کو باصرار باز رکھنے کی کوشش کی اور یہ بھیجا کہ موقع مناسب نہیں ہے کیونکہ پہاڑی راجہ دشمن ہو رہے ہیں اور رسد اور بار برداری کافی نہیں ہے۔ لیکن مہاراجہ نے اس کی ایک بات نہ مانی۔ اس نے

خود ایک حصہ فوج کو کمان میں لیا اور دوسرا حصہ دیوان رام دیال کی سرکردگی میں دیا جو کھم چند کا پوتا اور ایک دلیر نوجوان تھا اور اس سے پہلے کئی جہات میں کارہائے نمایاں انجام دیکر نام پیدا کر چکا تھا۔ راجہ اگر خاں نے جو راجپوری کا راجہ تھا جہاں رنجیت سنگھ نے پہلا پڑاؤ کیا مہاراجہ کو یہ صلاح دی کہ اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصے کو اپنے ہمراہ پونچھ کے راستے سے لے جائے اور دوسری کو رام دیال کی سرکردگی میں بہرام گلا کے راستے سے روانہ کرے۔ یہ تجویز پہاڑی استوں کی دشواریوں کے لحاظ سے گویا ضروری ہو لیکن بد قسمتی ہے اس کا نتیجہ برعکس نکلا۔ ایک حصہ دوسرے حصے کی مدد نہ کر سکتا تھا اور کارگزار دشمن دونوں کو یکے بعد دیگرے برباد کر سکتا تھا۔ کشمیر کے صوبہ دار نے ایسا ہی کیا اور عین اس وقت جبکہ سنگھ کوچ اور سفر سے بالکل تھکے ماندے پیر پچال کے درے سے پیٹے وادی میں اترے ہی تھے اس نے اپنی تمام فوج سے رام دیال کے دستہ فوج پر حملہ کر دیا۔ رام دیال گو بڑی بہادری سے لڑا۔ لیکن دشمن کی فوج کثیر تھی کچھ بس نہ بیل سکا اور اس کے بہت سے سپاہی مارے گئے۔ بہر حال وہ لڑتا بھڑتا وادی کے ایک محفوظ مقام تک جا پہنچا اور وہاں کمک کا منتظر رہا۔ مہاراجہ نے بھائی رام سنگھ کی سرکردگی میں کمک روانہ کی۔ یہ سردار بہت کارگزار تھا مگر رام دیال کی کسی قسم کی مدد نہ کر سکا اور مہاراجہ کے پاس واپس آیا۔ رنجیت سنگھ نے یہ دیکھ کے کہ دشمن کی اُس سے بہتر اور فہم فوج کے مقابلے میں آگے بڑھنا ناممکن ہے واپسی کا قصد کیا۔ عقب میں پہاڑی راجہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ کثرت بارش سے ندی نالوں کے چڑھنے سے راستہ ناقابل گزار ہو گیا۔ سخت دشواریوں اور بھاری نقصان اٹھا۔ رنجیت سنگھ پہاڑی راستوں سے نکل کے لاہور واپس آیا۔ رام دیال تنہا رہ گیا تھا مگر اُس نے اپنے بل بوتے پر وہ مردانگی دکھائی کہ عظیم خاں کو مجبوراً اس دشمن کے ساتھ تصفیہ کرنا پڑا جس کو وہ ہلاک نہ کر سکا۔ اس نے اسے صحیح سلامت پنجاب واپس جانے دیا پڑا۔

یہ ہم کا انجام تباہی اور رنجیت سنگھ کی فوجی قابلیت نے کوتاہی کی۔ لیکن اس کا استقلال فوجی قابلیت سے کہیں زیادہ عجیب و غریب تھا۔ دوسرے سال وہ پھر کشمیر پر قبضہ کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ یہ موقع اسے فوراً نہ مل سکا۔ کیوں کہ

وزیر فتح خاں ہرات و کابل سے واپس آکر اپنے بھائی صوبہ دار عظیم خاں کے ساتھ مل گیا اور دونوں کی متحدہ قوت پر حملہ کرنا مشکل تھا۔ بہر حال رنجیت سنگھ نے راجوڑی راجہ سے اس کی دغا بازی کا بدلہ لیا اور اس کے محل و شہر میں آگ لگا دی۔ آخر کار ۱۹۱۷ء میں اسے موقع ہاتھ لگ گیا۔ صوبہ دار کی عدم موجودگی میں اس نے مصر دیوان چندہ کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج کشمیر کی جانب روانہ کی۔ دیوان چندہ نے اس سے ایک سال قبل ملتان پر فتح پائی تھی اور رام دیال کو عقب کے فوج کی کمان دی گئی۔ گروہ کثرت بارش کی وجہ سے نہ فوراً آگے بڑھ سکا اور نہ لڑائی میں کوئی کام کر سکا۔ لیکن اس وقت مقابلہ بھی کچھ زیادہ نہ ہوا۔ زبرخان جو قائم مقام تھا بھاگ نکلا اور کشمیر کا صوبہ رنجیت سنگھ نے اپنے ملک میں شامل کر لیا۔ موتی رام دیوان کھم چند کا بیٹا اور رام دیال کا باپ پہلا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔

اس وقت سے اس زمانے تک جب انگریزوں نے گلاب سنگھ کو یہ صوبہ عطا کیا یہاں کے حالات سکھوں کے دوسرے اضلاع سے کچھ علیحدہ نہ تھے۔ بجز اس کے کہ صوبہ لاہور سے دور تھا اس وجہ سے صوبہ دار رعایا کے ساتھ معمول سے زیادہ جبر و تعدی کرتے تھے۔ کیونکہ وہ قہریم کے مواخذے سے بالکل مطمئن تھے بعض اوقات ان لوگوں کی جبر و زیادتی اس حد تک ناقابل برداشت ہو جاتی کہ رعایا بناوٹ کرتی جو عوام الناس کی جانب سے حکام کے ظلم و زیادتی کا جواب ہوتا ہے۔ ہمارا جہ متنبہ ہو کر ظالم نائب کو بدل کے کسی اور کو مقرر کر دیتا جس کا لالچ اس سے کتر ہو۔ دیوان موتی رام اور اس کا چھوٹا لڑکا کرپا رام ہیئت مجموعی اس سخت زمانے کو مد نظر رکھتے ہوئے سب سے اچھے صوبہ دار تھے اور ان کا دور حکومت ۱۸۳۷ء تک رہا۔ جس میں صرف دو مرتبہ وقفہ پڑا۔ پہلا تو ایک کاہل شخص تھا جو نظم و نسق کے جھگڑوں میں کم پڑتا تھا دل سے نیک تھا اور لوگ اس سے محبت کرتے تھے۔ جب ۱۸۳۷ء میں اس کا بڑا بیٹا رام دیال ہزارا میں مارا گیا تو اس نے ملازمت کو استعفا دیا تا کہ بنارس جا کر بود و باش اختیار کرے۔ ہمارا جہ نے ہری سنگھ نلوا جتکو سر دار کو اس کا جانشین مقرر کر کے روانہ کیا۔ لیکن اس شخص کے خیالات اصول سلطنت کے بارے میں اس قدر دقیاوسی تھے کہ کشمیریوں نے

بناوت کی اس لئے موتی رام کو پھر بھی جانا پڑا جو ۱۸۲۶ء تک وہاں صوبہ دار رہا جب کہ راجہ دھیان سنگھ کی انتہا پر دازیوں سے اس خاندان کی عزت و وقعت مہاراجہ کے دربار میں کم ہو گئی تھی اور اس کی جگہ دیوان چنی لال ایک معمولی شخص ڈیڑھ سال تک کام انجام دیتا رہا۔ اس کے بعد دیوان کرپارام صوبہ دار مقرر کیا گیا یہ شخص ذی فہم تھا اور بادو جو دیکہ دیش تھا لیکن اس کے خیالات بہت عالی تھے۔ اس نے راجہ دھانی میں عمدہ عمدہ عمارتیں اور تفریح گاہیں بنا کے اسے بہت آراستہ کر دیا۔ سری نگر کا رام باغ جہاں مہاراجہ گلاب سنگھ کی یادگار قائم ہے اسی کا لگایا ہوا ہے۔ ۱۸۲۸ء میں کشمیر کو زلزلوں کی وجہ سے بہت کچھ نقصان پہنچا بہت سے سرکاری اور رعایا کے مکانات برباد ہو گئے اور بکثرت جانیں تلف ہوئیں۔ زلزلے کے بعد بیضہ آیا۔ یہ وہاں سے زیادہ مہلک تھی جس نے موتی رام کے زمانے میں ملک کو ویران کر دیا تھا۔ ۱۸۳۱ء میں پھر دیوان کرپارام کو راجہ دھیان سنگھ کی دشمنی کے باعث نقصان اٹھانا پڑا اس نے بھمبر کے راجہ فیض طلب خاں کو اپنی حفاظت میں رکھا تھا جس سے دونوں دو گڑا راجہ متفرق تھے اور اس کو قید کر لینا چاہتے تھے اور کرپارام نے اس کے حوالے کرنے سے قطعی انکار کیا تھا۔ اسے کشمیر سے بلا لیا گیا اور اس کے بعد ہی وہ پنجاب سے نکل کے اپنے باپ کے پاس بنارس چلا گیا۔ تین پشتوں تک اس کے خاندان نے مہاراجہ کی خدمت گزاری میں کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے لیکن اس کی وجہ سے وہ رنجیت سنگھ کی ناقدری کے سلوک سے محفوظ نہ رہ سکا۔ رنجیت سنگھ کو ایسے لوگوں کی کوئی پروا نہ ہوتی تھی جو اپنا کام کر چکے تھے یا جن سے اس کا کوئی نیا منظور نظر برسرِ رخاش ہوتا تھا۔ رنجیت سنگھ کی یہ خود غرضی اور وفادار اشخاص کے ساتھ بد سلوکی کر نیکے بہت ہی بد نما و صے اس کے واس پر ہیں۔ دیوان مکھ چند جو دیوان خاندان کا بانی تھا اس کا بہترین فوجی افسر تھا جسے ہمیشہ کامیابی حاصل ہوتی رہی اور زیادہ تر اسی کی فوجی قابلیت کی بدولت مہاراجہ پنجاب کا بلا شرکت غیرے حاکم بنا۔ لیکن یہ تمام خدمات اس کے بیٹے موتی رام یا اس کے پوتے کرپارام کو تذلیل تاوان ضبطی جائداد اور بالآخر انھیں برباد ہونے سے نہ بچا سکیں۔

۸۰۹ء میں مہاراجہ نے کانگڑا اور اس کے گرد و نواح کے پہاڑی اضلاع کو پورا کر لیا تھا۔ یہ واقعہ بھی اس کی فطرتی دغا بازی کی یادگار رہیگا۔ راجہ سنہ ۸۱۰ء میں راجپوتوں کے شریف ترین خاندان کا سرگروہ تھا اور اس کی ذاتی مہابت اور قدامت خاندانی کی وجہ سے اس کی بڑی تعظیم کی جاتی تھی۔ اٹھارھویں صدی کے ربع آخر میں جب کہ بل چل چلی ہوئی تھی اس نے آس پاس کے راجپوت ریاستوں پر اپنی حکومت قائم کر لی اور کئی بار دشمنوں کے باہم متحد ہو کر برسرِ مقابلہ ہوئے لیکن وہ مہانت میں کامیاب رہا۔ ۸۱۲ء میں اس نے سردار جے سنگھ کنھیا سے کانگڑا کا مشہور قلعہ حاصل کیا جسے اس زمانے کی فوج اور توپ خانہ مسخر نہ کر سکتا تھا اور جس پر قبضہ ہونے سے آس پاس کے ملک پر اس کی دھاک بیٹھ گئی۔ مہاراجہ عرصے سے اس کا رآمد جگہ سے اس کو بیدخل کرنے کی تاک میں لگا ہوا تھا۔ یہ موقع اسے اس وقت نصیب ہوا جبکہ کھلو ر راجہ مان سنگھ کے بلانے پر گورکھوں نے کانگڑا پر حملہ کر کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے نے کئی سال تک طول کھینچا اور سنہ ۸۱۶ء میں مستقل مزاج دشمن کو آخر تھکا دیتا لیکن کیسی بُری گھڑی تھی کہ اس نے رنجیت سنگھ سے مدد چاہی جس نے طرفین سے سازش کر کے قلعے پر قبضہ کر لیا اپنی فوج کو نیپال کے جنرل راجہ امر سنگھ تھپہ کی امدادی فوج ظاہر کیا۔ قلعے میں داخل ہوتے ہی اس نے دونوں راجپوت اور گورکھوں پر تہقید لگایا اور خود قلعے پر قابض ہو گیا۔ یہ دھوکے کی چال بہت کامیابی کے ساتھ انجام دی گئی اور ویسی ہی اس عزمین کی اور قدر کی سزاوار ہے جو تواریخ میں ایسی خدایوں کی ہوتی رہی ہے۔ اس واقعے کے کئی سال بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کانگڑا کی تمام ریاستوں پر قبضہ کر کے ان کو اپنے ملک میں شامل کر لیا۔ راجہ سنہ ۸۱۷ء میں مرچکا تھا۔ اس کا بیٹا انرو دھ سنگھ اپنی ریاست میں باجگزار کی حیثیت سے تھا راجہ دھیان سنگھ نے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کو ہمیشہ برائی کی ترغیب دیتا اور اپنے آپ کو جہوں کے قدیم خاندان کا جائز وارث ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا مہاراجہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ انرو دھ چند کی بہن کی شادی اسکے بیٹے ہیر سنگھ کے ساتھ کرادی جائے جو ایک خوبصورت نوجوان اور دربار میں

ہر دلعزیز تھا۔ مغرور راجپوت نے جو کھٹوچ خاندان کی اولاد ہونے کی وجہ سے ڈوگر راجہ کو نو دولت سمجھ کے نظر حقارت سے دیکھتا تھا اس نسبت سے قطعاً انکار کیا اور اپنے خاندان کو ہمراہ لیکر لاہور سے تلج عبور کر کے سرکار انگریزی کی حفاظت میں چلا گیا۔ مہاراجہ نے اس ددٹوک جواب سے ناراض ہو کر اس کی تمام جائداد ضبط کر لی اور اگلے سال ۱۸۲۹ء میں اس راجپوت راجہ کا سر نیچا کرنے کے خیال سے اس نے خود از رو دھچک کی دوناجایز سوتیلی بہنوں سے شادی کر لی جن میں سے ایک تو اس کی زندگی میں مر گئی اور دوسری اس کے مرنے پر پتی ہوئی تو مہاراجہ کے پیشادرا اور ہزارہ کے پہاڑی ملک کی فتح کا مختصر ذکر مناسب ہے یہ بڑی طولانی اور دشوار مہم تھی جس میں اس کا بہت سارو پیہ افسر اور فوج ضائع ہوئی نیز پنجاب کے اسلامی قبائل کے مغلوب کرنے کا حال جو دیسے ہی جنگجو اور بہادر تھے جیسے سکھ۔ ان فرقوں میں جس چیز کی کمی تھی وہ صرف یہ تھی کہ ان میں باقاعدہ انتظام اور ایکانہ تھا۔ اور یہی اوصاف تھے جو مہاراجہ میں نمودار تھے اور جس کی وجہ سے وہ ان فرقوں سے ہر ایک کو جداگانہ مغلوب کر سکتا تھا اگر یہ باہم متفق ہو جاتے تو بڑی کامیابی سے ہٹا سکتے تھے۔ کوئی مسلمان ایسا قابل نہ تھا جو اپنے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سبز نشان کے نیچے اپنے ہم مذہبوں کو جمع کر کے شمالی پنجاب میں ایسی اسلامی سلطنت قائم کر سکتا جو لاہور کی سکھ حکومت کی حریف اور مد مقابل ہوتی۔ چند اشخاص نے جن میں مجنونا مذہبی جوش تھا مثلاً سید احمد شاہ پہاڑی نے لڑنے والوں کی متضاد جماعتوں کو اکٹھا کر کے بے انتہا سرایتگی پیدا کر دی اور سکھوں اور دوسرے کافروں کے خلاف جہاد کرنے کا وعظ کیا لیکن انکا جوش پھوس کی آگ کے مثل بھڑک کے رہ گیا۔ انھوں نے صرف بکاڑ دیا مگر کچھ بنانہ سکے۔ موٹی سمجھ والے۔ قوی اور اپنی ہٹ کے پورے سکھوں کو لازمی طور پر فتح نصیب ہوئی اور وہ اسکے مستحق تھے جن کی رہنمائی پر ان کا مستقبل مزاج مہاراجہ تھا جس کا عمل دریا کے چڑھاؤ کی طرح آہستہ مگر یقینی اور ناقابل مزاحمت تھا تو سکھوں اور ان کے راجہ کے حالات سے انگریز ناظرین کو

غلط فہمی ہوگی اگر یہ خیال ذہن نشین ہو جائے کہ پنجاب ایسا صوبہ ہے جس میں خصوصاً ہندو لوگ بستے ہیں اور اس میں پہلے ہندو مذہب کے خلاف گرو گوبند سنگھ جی کا بانی تھا جو اس مذہب کے تابع تھے دفعۃً اور غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی۔ پنجاب آج بھی اور رنجیت سنگھ کے زمانے میں بھی ہندو مسلمان دونوں میں تقریباً مساوی طور پر تقسیم ہے۔ جنوبی اور وسطی اضلاع کے بڑے شہروں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے لیکن عموماً یہ کہا جاسکتا ہے دریائے چناب کے مشرقی اضلاع میں ہندو ہیں اور مغرب میں مسلمان۔ جس قدر ہم سرحد اور پہاڑی سلسلوں کی طرف بڑھتے چلے جائیں ہندو آبادی کی مقدار فیصدی برابر کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ سرحدی اضلاع کی آبادی میں قریب قریب مسلمان ہی پائے جاتے ہیں۔ بحجز تجارت پیشہ یا ساہوکاروں کے جو اکثر ہمیشہ ہندو ہوتے ہیں۔ یہاں تک وسط ایشیا کے شہروں میں جہاں تعصب زیادہ ہے یہ لوگ آباد اور خوشحال ہیں۔ مسلمانوں کے بہت سے فرقے قدیم ہیں اور بہت اہمیت رکھتے ہیں جنہیں گہکڑ۔ جو درہ۔ جنجوہ۔ آوان۔ توانا۔ سیال۔ کھرال۔ کھتر۔ غیبا۔ اور گوکھڑ۔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں جولاہور کے مغربی سمت کے غیر کوہستانی ملک یا دریائے سندھ اور چناب دریاؤں کے درمیان بیٹھ اور کوہستانی ملک میں آباد ہیں۔ ان میں سے بعض اپنے آپ کو پرہیسی نسل سے بیان کرتے ہیں مثلاً گھکڑ فارس سے آوان افغان یا باختری یونانیوں سے لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا یہ سمجھا جائے کہ یہ ان لوگوں کے ماوراء ہیں جو ایرانی نسلیں ہندوستان میں متواتر فاتحین کے ساتھ دریائے ستلج کی طرح نازل ہوئی تھیں۔ ان فرقوں کے گذشتہ حالات سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ ان کے ماقبل کے واقعات راجپوت اور جاٹوں سے کسی خصوصیت کے ساتھ مختلف تھے۔ دوسری اور ہندو ذاتوں کی طرح ان پر بھی صحیح اور حقیقی طور پر ہندی الاصل کا اطلاق ہوتا ہے۔ ان کے ابتدائی زمانے میں اسلام قبول کرنے سے ان کی قومی خصوصیات کو تغیر یا نقصان پہنچنے کے بجائے اور

مستحکم کر دیا۔ ان فرقوں میں سے اکثر کا باہمی تعلق عام آشکارا ہے تو انا۔ سیال
غیا اور بھاو لپور کے داود پتر سب کے سب یکجہری ہیں گو موخر الذکر اپنا
سلسلہ نسب حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے ملا کے دل خوش کرتے ہیں (جو رسول خدا
صلی اللہ علیہ وسلم کے عم بزرگوار تھے)۔ لیکن یہ لوگ اور پنجاب کی دوسری
قدیم ذاتوں کی طرح راجپوت نسل کے ہیں۔ غالباً پنجاب پر راجپوتوں نے تین مرتبہ
چڑھائی کی پہلے تو اس زمانے میں جبکہ تلخ کی بنیاد ہی نہ پڑی تھی تقریباً ڈھائی ہزار سال
قبل مسیح۔ کھٹوچ اور چیمہ اور جالندھر کی پہاڑیوں کے راجگان جن کے آباؤ اجداد
باری اور رچنا کے دو آب پر حکمران تھے اب ان لوگوں کے یادگار ہر دوسرا
نقل مکان اس کے ایک ہزار سال واقع ہوا اس وقت ادجمیدانے جو ہشتناپور کی
ریاست کے بانی کا فرزند تھا۔ اپنے یار و راجپوتوں کو جھلم کے شمالی جانب لجا کر
ایک خاندان کی بنیاد ڈالی جس کی حکومت اس قطعہ ملک پر رہی جو راولپنڈی
سے لیکر ملتان تک پھیلا ہوا ہے۔ سب سے آخر تارک وطن جنوب کی سمت
سے آئے جن کا سلسلہ عرصے تک دسویں صدی عیسوی سے لیکر نپدرھویں
صدی عیسوی تک جاری رہا۔ اس وقت مختلف اقوام کے راجپوت پنجاب
میں آئے۔ انھیں کی اولاد جاٹ۔ توانا۔ سیال۔ غیمہا۔ کوکھر اور دوسرے

مشہور فرقے ہیں

ہندوستان کی ویسی فوج کا ممتاز حصہ مسلمان ہیں۔ اگرچہ میں نے اس سے
قبل یہ بیان کیا ہے کہ بحیثیت مجموعی صلح و جنگ۔ امن جن کے زمانے میں چھاؤنیوں کی
مخرب اخلاق زندگی پالائی کے مولناک جوش و خروش میں سکھ بہترین فوجی مواد
تصور کیئے جاتے ہیں لیکن پنجابی مسلمان بھی ان سے کچھ بیٹے نہیں ہیں۔ لڑائی
کے مواقع پر ان کا جوش و خروش اور بھی زیادہ ناقابل مزاحمت ہوتا ہے اور
ان کی بہادری اور جنگ کا شوق ویسا ہی بڑھا ہوا ہے جیسا کہ سکھوں کا لیکن
لڑائی کے رک جانے کے انقلاب یا شکست کے موقعوں پر ان کا استقلال
سکھوں کا سا نہیں اور نہ وہ امن کے زمانے میں اپنے وطن سے دور فوج
میں رہ کر کام کرنا پسند کرتے ہیں۔ وہ سکھوں کی طرح عام طور پر مفید نہیں ہیں۔

وہ ان کی طرح غیر متاثر اور فوجی خدمت میں برائی بھلائی باتوں کو یکساں طبیعت نہیں رکھ سکتے۔ لیکن وہ اعلیٰ درجے کے سپاہی ہیں۔ چنانچہ توانا۔ سیال اور ملتانیوں نے ۱۷۹۸ء و ۱۷۹۹ء میں انگریزوں کی طرف جنگ میں کارہائے نمایاں انجام دیکر امتیاز حاصل کیا۔

ہمارا جہ نے پہلے ان فرقوں پر حملہ کر کے مغلوب کیا جو لاہور کے گرد و نواح میں تھے۔ سب سے پہلے کھرال سے اس کی ٹڈی بھڑ ہوئی جن کے ۴۰ مواضعات شیخوپورہ اور جھنگ کے قریب تھے۔ یہ لوگ بہت شورہ پشت اور چور تھے اور کسی کی ماتحتی انھیں گوارہ نہ تھی۔ دوسرے مسلمان فرقوں کی بہ نسبت ان میں مذہبی غلو زیادہ تھا۔ انھوں نے ہندوؤں کی حکومت کو بڑے اکراہ سے مانا اور دیوان سادوں مل اور دوسرے سکھ سرداروں کو ان کی روک تھام کرنے میں اپنی تمام قوت صرف کرنی پڑی کیونکہ جب کبھی کوئی باقاعدہ فوج ان کے مقابلے پر روانہ کی جاتی تو یہ لوگ گھسنے جنگلوں اور وادیوں میں جا چھپتے اور وہاں ان کا تعاقب کرنا دشوار ہوتا۔ ۱۷۹۸ء میں ہمارا جہ نے ان کا علاقہ اپنے ملک میں شامل کر لیا اور اس کے بعد ان کے پردس سیال کی جانب رخ کیا جو جھنگ۔ لیہہ اور چنیوٹ کے قریب رہتے تھے اس نے ان کے سردار احمد خاں سے ساٹھ ہزار سالانہ خراج وصول کیا اور تین سال کے بعد ان کا ملک چھین کر سردار فتح سنگھ۔ کلیان والہ کو زراعت کے لیے دیدیا۔ توانا اس وقت اس قدر قوی تھے کہ ان پر کھلم کھلا حملہ کرنا دشوار تھا گو کہ ۱۷۹۸ء میں ہمارا جہ نے ان کے سردار خان بیگ خاں کو بیماری سے گرفتار کر کے اس کے بھائی کے پاس بھیج دیا جس نے اسے قتل کر دیا۔ رنجیت سنگھ کو اس کے معاوضے میں ایک لاکھ روپے مل گئے۔ ۱۷۹۸ء سے قبل وہ توانا کے سردار پیمہ بمقام نور پور حملہ کر کے اس کا قلعہ فتح نہ کر سکا گو احمد یار خاں نے جو اس وقت سردار تھا پھر اپنا ملک واپس لے لیا لیکن یہ قبضہ عارضی تھا۔ منکیرہ کے نواب کی مدد سے جو اس کا قریب و دشمن تھا رنجیت سنگھ کی اطاعت قبول کرنے پر وہ مجبور کیا گیا۔ ۱۷۹۸ء میں جب ہمارا جہ نے منکیرہ کے نواب حافظ احمد خاں پر حملہ کیا تو اس وقت توانا کو بدلہ لینے کا

موقع ہاتھ آیا۔ یہ لوگ بہت جوش و خروش سے اس مہم میں شریک ہوئے منکیر عین صحرا میں واقع تھا اور اس کے گرد ۱۲ قلعے تھے جن سے باہر ملک میں کہیں ایک بھی کنواں نہ تھا۔ اس لئے اس کام میں بہت دشواریاں تھیں۔ مہاراجہ بذات خود فوج کی کمان کر رہا تھا۔ اس کا استقلال تمام قدرتی دشواریوں پر غالب آیا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا اور راستے میں کنوئیں کھدواتا چلا گیا اور بالآخر قلعے کا محاصرہ کر لیا جو ۲۵ دن کے بعد حوالے کر دیا گیا۔ نواب کو ڈیرہ اسماعیل خاں کی صوبہ داری پر بحال رکھا جو نہایت شورش انگیز ضلع تھا جس کو سکھ قابو میں نہ رکھ سکتے تھے۔

اس مہم میں تو انوں نے اس درجہ بہادری ظاہر کی کہ مہاراجہ نے ان میں سے ۵۰ اشخاص کو اپنے ہمراہ لجا کر اپنے ذاتی محافظ دستہ فوج میں مامور کیا۔ یہ لوگ درحقیقت بڑے خوش رو ہوتے ہیں۔ مجھے اب تک فتح شیر خاں اور شیر محمد خاں دو توانا سرداروں کی صورتیں یاد ہیں جو ایک دوسرے کے رقیب تھے اور جنہیں میں نے ۱۸۶۷ء میں لارڈ لارنس کے دربار کے موقع پر لاہور میں دیکھا تھا۔ اس مشہور تاریخی موقع پر یہ دونوں تمام مجمع میں سب سرداروں سے زیادہ وجہ نظر آتے تھے۔ قصور کا شہر جو لاہور سے تقریباً ۵۰ میل کے فاصلے پر ہے ایک مسلمان پٹھان خاندان کا صدر مقام تھا جس نے اٹھارہویں صدی کے نصف اواخر میں سکھوں کی مدافعت نہایت کامیابی کے ساتھ کی اور جو شاہی میں رنجیت سنگھ کے لاہور لینے کے موقع پر اس کے خلاف اتحاد میں شریک ہو گیا تھا۔ مہاراجہ نے کئی مرتبہ اس خاندان پر حملہ کیا اور شاہی میں اس نے اپنی تمام فوج لیکر قصور پر چڑھائی کی اور نواب قطب الدین کو نکال باہر کیا۔ نواب قطب الدین اپنی ریاست واقع مٹھوٹ میں چلا گیا جو ستلج کے جنوبی کنارے پر تھی اور جس پر اب تک اس کی نسل کے لوگ قابض ہیں جو گھکروں کا شجاع فرقہ جس نے ہندوستان کی تاریخ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں کئی سال تک کشمیر پر حکومت کرتا رہا اور ہندوستان کے حملہ آور شاہنشاہوں کے ساتھ شان و شوکت سے شریک کارزار رہا۔

سلطان مقرب خاں کی شکست کے بعد جو ۱۷۵۶ء میں گجرات کی فطیل کے نیچے سردار گجر سنگھ کے مقابلے میں ہوئی تھی سکھوں سے عہدہ برانہ ہوسکا۔ اس وقت اضلاع گجرات - راولپنڈی کا ایک حصہ کثیر اور جھلم گھکروں کے قبضے میں تھے۔ مہاراجہ کے نائب بدھ سنگھ سندھن والیہ اور جہون کے گلاب سنگھ کے جبر و قہر نے انھیں پامال کر دیا۔ ۱۷۵۶ء میں ان کا رہاسا اقتدار بھی جاتا رہا۔ سرکار انگریزی ہی کا حصہ تھا کہ اس خاندان کی گم شدہ دولت کسی قدر پھر اس کے ہاتھ لگی ہو۔

آدان فرقہ اس قدر پر آگندہ تھا کہ سکھوں کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر سکتا تھا۔ ان کا خاص گانوں شمس آباد جنرل مکھن چند نے ۱۷۵۶ء میں اس پاداش میں برباد کر دیا کہ ان لوگوں نے اٹک کے محاصرے کے وقت کابل کی فوج کی مہانداری بجز واکراہ کی تھی۔ لیکن ان کے موروثی مقبوضات سے جو راولپنڈی جھلم اور شاہ پور میں واقع تھے کوئی تعرض نہیں کیا گیا صرف انھیں ان اضلاع کے سکھ صوبہ واروں کو خراج ادا کرنا پڑا۔ ججوبھیوں کے ساتھ بھی یہی پیش آیا جن کی دوستانہ شرکت مہاراجہ کے والد مہان سنگھ کے ساتھ تھی ہو۔

جب ایک قدیم راجپوت فرقہ کانگڑا - جہون اور گجرات کے پہاڑی اضلاع میں منتشر تھا۔ اس میں سے اکثر مسلمان ہو گئے تھے لیکن کانگڑے میں یہ لوگ اپنے اصلی مذہب کے پابند تھے۔ بھنگی سرداروں و نیز مہان سنگھ سکھ اچا کیا نے اکثر ان پر چڑھائی کی لیکن ان کا ملک بہت دشوار گزار تھا اور ان کو مغلوب کرنا مہاراجہ کے نصیب میں تھا۔ ۱۷۵۶ء میں سردار صاحب سنگھ سے گجرات لینے کے بعد رنجیت سنگھ نے راجہ عمر خاں چب سردار کے دوستی قلعوں چوئیاں اور سنگھما کی طرف رخ کیا وہ اطاعت پر مجبور ہوا اور اس کی وفات کے بعد جو چند ہی ماہ کے بعد واقع ہوئی اس کے تمام مقبوضات ضبط کر لیے گئے ہو۔

اسی سال مہاراجہ ساہوال کے بلوچ سردار فتح خاں کے مقابلے کے لیے روانہ ہوا۔ فتح خاں بڑا ہی اقتدار تھا اس نے کامیابی کے ساتھ بھنگی سرداروں

سے مقابلے کئے اور ان سے بہت سے مفتوحہ اضلاع واپس چھین لئے۔ مہاراجہ کے باب نے اسے خفیف رقم بطور خراج ادا کرنے پر مجبور کیا تھا۔ سن ۱۸۴۷ء میں رنجیت سنگھ نے اس رقم میں بہت کچھ اضافہ کر دیا۔ یہ رقم باقاعدگی سے ادا نہ کی جاتی تھی۔ یہ ایک بھانہ الحاق کے لئے مل گیا اور مہاراجہ نے بڑی آمدگی سے اس سے فائدہ اٹھایا۔ سن ۱۸۴۷ء میں اس نے فتح خاں پر چڑھائی کر کے کیمبارگی قلعے پر قبضہ کر لیا اور فتح خاں کو اپنے ہمراہ لاہور لے گیا جہاں اس کو معقول جاگیر عطا کی گئی۔ فتح خاں چند سال تک تو رہا۔ لیکن بیکاری سے تنگ آکر وہاں سے بھاگ گیا اور ادھر ادھر پناہ ڈھونڈتا پھرا۔ بالآخر سن ۱۸۴۷ء میں یہ حالت جلاوطنی بھاو پور میں اس کا انتقال ہو گیا۔

اس طور پر یکے بعد دیگرے تمام مسلمان سردار مغلوب ہو گئے اور مہاراجہ کو سب پر فوقیت حاصل ہو گئی۔ سن ۱۸۴۷ء میں تو اس کی قوت گویا تمام پنجاب میں قطعی طور پر تسلط سے لیکر دریائے سندھ تک مستحکم ہو گئی جنوب میں انگریزوں کے زیر حفاظت ریاستیں اس کو روکے ہوئے تھیں اور شمال میں کابل کا افغان فرمانروا حق فتح اور احمد شاہ درانی اور تیمور کے نام سے شمالی ہند کی حکومت کا دعویدار تھا۔

حیدر علی لڑائی کا ذکر اس سے پہلے کیا جا چکا ہے جس میں سکھ فوج نے وزیر فتح خاں اور دوست محمد خاں کو جو آخر میں امیر کابل ہو گیا انکس کی فحیل کے نیچے شکست دی تھی۔ اس کے بعد دیوان رام دیال کے کشمیر سے اخراج۔ مہاراجہ کے بربادی کے ساتھ ہزیمت کرنے اور سن ۱۸۴۹ء میں بالآخر اس صوبے کو مطیع کرنے کے واقعات پیش آئے۔ ہزارہ کے شورہ پشت مسلمان فزوں کا مغلوب کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ انگریزی فتوحات کے بعد بھی انھوں نے اس قدر شوخیں برپا کیں کہ اکثر فوجی جہات ان کے مقابلے پر روانہ کرنا پڑیں۔ سکھ پہاڑی لڑائیوں کو پسند نہ کرتے تھے۔ بخلاف اس کے افغان اور یوسف زئی میدانوں کے مقابلے میں پہاڑی مقامات میں زیادہ اطمینان سے لڑ سکتے تھے اور ان کے حملہ کرنے کے قومی طریقے نے جنگلی و پہاڑی قطعات ملک میں نشوونما

پایا تھا جہاں وہ سرسپکار رہا کرتے تھے۔ ہزارے کا صوبہ دار کلہا سنگھ چینی بہادر سپاہی لیکن ظالم منتظم تھا۔ اس نے وہ ملک و ہزارے کی کمان پر مقرر کیا گیا تھا جب کہ اس نے فوجی کارگزاری نمایاں طور پر انجام دیکر ملک کے قلعے سے افغانوں کو نکال دیا تھا جس کو افغانوں نے پھر دفعۃً فتح کر لیا تھا۔ اس کی خود سری اور بالخصوص اس کے ایک ذی اقتدار اور متول سردار سید خاں کے بھانسی دینے سے تمام ملک میں اشتعالک پیدا ہو گئی اور مہاراجہ سنگھ نے اس میں پھر اسے واپس طلب کرنے اور دیوان رام دیال کو اس کے بجائے مامور کرنے پر مجبور ہوا۔

نوجوان و ناعاقبت اندیش جنرل بھیت شیر سنگھ جو برائے نام کیدان تھا اور فتح سنگھ ایلو والیہ پہاڑی راستے سے ہو کر کن گڑھ تک پہنچا جہاں یوسف زئی اور سوات جرگے مقابلے کے لیے مجتمع تھے دشمنوں کی تعداد سکھوں سے زیادہ تھی۔ اور ان جرگوں کو سابق صوبہ دار پرستو ہار فتح حاصل ہونے کی وجہ سے اپنے اوپر اعتماد ہو گیا تھا۔ سورج غروب ہونے تک لڑائی جاری رہی سکھ ٹھک کر اپنے مورچے پر واپس آ گئے دیوان رام دیال نے اپنے مختصر محافظ دستے کے سب سے آخر میدان سے واپس ہوا۔ اور دشمن نے اسے فوج سے علیحدہ دیکھ کر اس پر دھاوا کر دیا اور سخت مقابلے کے بعد اس کو اور اس کے تمام ساتھیوں کو مار ڈالا۔ سکھوں نے جب دیکھا کہ ان کا جنرل مارا گیا تو وہ بہت پریشان ہوئے اور دوسرے روز بھاگ کھڑے ہوئے۔ واپسی میں جس قدر مواضعات ان کے راہ میں پڑے ان سب میں آگ لگاتے گئے۔ رام دیال کی موت کا فوج کو بہت صدمہ ہوا لیکن اور بہت سے قابل عہدہ دار اس کی جگہ کام کرنے کے لیے موجود تھے جن میں سے ہری سنگھ ملوا اور بدھ سنگھ سدھن والیہ مہاراجہ کا رشتے کا بھائی زیادہ ممتاز تھے۔ رام دیال کی جگہ ہزارے کی صوبہ داری پر چھٹے سرداروں میں کا ایک سردار امر سنگھ مامور کیا گیا۔ اس پر بھی وہی گزری جو رام دیال پر گزری تھی۔ اسے بھی اسی طریقے سے دھند اور ترین جرگوں نے ہلاک کیا کیونکہ جب ایک گھسان مہر کے آرائی کے بعد یہ اپنے محافظ دستہ فوج کے ساتھ آرام لے رہا تھا کہ اس پر یورش کی گئی اور وہ قتل ہو گیا۔

۱۲۳۶ء میں پشاور کا شہر اور صوبہ مہاراجہ کا باجگزار ہو گیا۔ اس وقت اس پر افغان حکمران کی جانب سے یار محمد خاں مامور تھا۔ یار محمد خاں کا بھائی محمد عظیم خاں فتح خاں کے بجائے برائے نام وزیر لیکن دراصل کابل اور شمالی افغانستان کا حکمران ہو گیا تھا۔ محمد عظیم خاں اپنے بھائی پشاور کے صوبہ دار سے اس وجہ سے ناراض ہو کر کہ اس نے مہاراجہ سے دوستی اور اطاعت کا معاہدہ کیا کابل سے کثیر فوج لیکر روانہ ہوا اور راستے میں یوسف زئیوں کے وحشی جہرگے کو سکھوں کے خلاف جہاد پر آمادہ کیا۔ نوشہرہ کے قریب تہری کے مقام پر جواہرک اور پشاور کے درمیان میں تھا سکھوں سے اس کی ٹھبھڑ ہوئی۔ یہ ایک معرکہ الآرا مقابلہ تھا اور اس سے ہمیشہ کے لئے یہ فیصلہ ہو گیا کہ تہر کے شمال اور شمالی مغربی سرحد پر سکھوں کی حکومت رہے یا افغانوں کی۔ مہاراجہ بذات خود دریائے کابل کے بائیں جانب فوج کی کمان کرتا تھا جہاں یوسف زئی ٹھہرے ہوئے تھے۔ سکھ فدائی اکالی اور مسلمان غازیوں کی باہم دست بدست لڑائی ہوئی۔ اس مقابلے میں اکالیوں کو بالآخر ہزیمت نصیب ہوئی ان کا سردار بھولا سنگھ جس سے لوگ عام طور پر خائف تھے مارا گیا۔ لیکن مہاراجہ نے ان جہرگوں کو بھگا دیا۔ دریائے دوسری جانب سردار ہری سنگھ نلوانے جو سکھوں کی اصل فوج کا کیدان تھا جنرل ونٹوراج سردار خوشحال سنگھ اور سردار بدھ سنگھ سندھن والیہ کے ساتھ افغان فوج کا مقابلہ کیا جو عظیم خاں کے زیر کمان تھے عظیم خاں نے عرصے تک مقابلہ نہ کیا بلکہ پشاور کی طرف روانہ ہو کر دروں میں چلا گیا۔ مہاراجہ نے شہر کو لوٹ لیا اور اس کے بعد وہ واپس چلا گیا۔ جاتے وقت وہ یار محمد خاں کو اس شہر پر صوبہ دار مقرر کر گیا کہ وہ سالانہ خراج ادا کیا کرے۔ اس وقت سے ہزارہ پشاور اور سرحدی اضلاع ہمیشہ مہاراجہ کے لئے باعث تکلیف رہے جہاں اس کو بہت کچھ مصارف برداشت کرنا پڑے۔ باریق زئی سرداروں اور غیر تربیت پذیر و مذہبی دیوانہ جہرگوں سے متواتر برسر مقابلہ ہونے کی وجہ سے اس کے بہت سے بہترین عہدہ دار اور فوجیں ضائع ہوئیں سرحد کی طویل اور ایک ہی نوعیت کی لڑائیوں کے ذکر کی اس مختصر سلسلے میں گنجائش نہیں ہے۔

اس صورت حال میں سید احمد شاہ کی وجہ سے اور بھی شدت پیدا ہو گئی۔ یہ صاحب نصیر آباد کے رہنے والے تھے جو شمالی مغربی صوبے میں واقع ہے۔ سید احمد شاہ نے اپنے مذہب اور ہم مذہبوں کی دینی حمایت میں سکھوں کی مداخلت پر آمادہ ہو کر پیشاور کے پہاڑی ملک میں تبدیل وطن کر کے سکونت اختیار کی۔ انھوں نے کافروں کے برخلاف جہاد کرنے کا وعظ شروع کیا۔ یہ ہندوستانی و بابی فرقے کے بانی تھے۔ اس فرقے کی وجہ سے مختلف مواقع پر حکومت ہند کو بہت کچھ پریشانیاں لاحق ہوئیں گو اس کے بہت سے افراد وفادار اور پابند قانون ہیں جو دوسرے مسلمانوں سے عبادت کی سادگی کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ دیگر افراد جو غنڈہ باغی تھے اور جن میں مذہبی دیوانگی تھی ہمیشہ سرکار سے برسرِ مقابلہ رہے اور شورش کے زمانے میں بدولی اور تنفر پھیلانے میں سعی رہے۔ اگرچہ ہندوستانی مسلمانوں نے سرکار انگریزی کے برخلاف جہاد کو ناجائز تسلیم کیا ہے کیونکہ اس نے دوسری اسلامی حکومتوں سے زیادہ مسلمانوں کو مذہبی آزادی دے رکھی ہے لیکن ۱۸۴۳ء میں سکھوں کے خلاف جو جہاد ہوا اتحاد اس سے کہیں مختلف تھا۔ مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں سکھوں پر بہت مظالم کئے تھے۔ ان کے بزرگوں کو قتل اور ان کی عبادت گاہوں کو نجس کر دیا تھا۔ اب بدلے کا وقت آیا تھا اور اسلام کے پیروں کو گو بند سنگھ کے تابعین پامال کر رہے تھے۔

سردار ہری سنگھ نلوا ہزارے کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ اس کی درستی اور مسلمانوں سے نفرت و حقارت سے پیش آنے کی وجہ سے لوگ مذہبی جوش میں آکر اکثر ہنگامہ آرائیاں کیا کرتے تھے۔ ۱۸۴۷ء میں درہند میں ہنگامہ برپا ہوا۔ اس کے دوسرے سال یوسف زئیوں نے سکھوں سے گینج گنی تعداد میں جمع ہو کر اسے گھیر لیا لیکن اس نے بڑے استقلال و بہادری سے لڑ کر انھیں شکست دی۔ اس کی مدد کے لیے سردار بدھ سنگھ سندھن والیہ جیسا کارآزودہ سپاہی روانہ کیا گیا۔ رنجیت سنگھ اپنے اس رشتے کے بھائی سے مشتبه ہو گیا تھا اور اس لیے اسے سرحد پر اس امید پر بھیج دیا تھا کہ وہاں کی مہات سے دربار میں واپس آنا نہ نصیب ہو۔ اس کے تنزل کی بنیاد ہوئی کہ ۱۸۴۷ء میں جب

مہاراجہ امرتسر میں بہ مقام رام باغ بیمار پڑا تو طبیب اس کی زندگی سے بالکل ہاپوس ہو گئے بدھ سنگھ نے جو ایک ذی اقتدار سردار تھا اپنے بے باک اور ناعاقبت امیش بھائی عطر سنگھ اور لہنا سنگھ کے ساتھ آئندہ خطرے کی پیش بندی کے خیال سے قلعہ گو بند گڈھ پر رات کے وقت دفعۃً قبضہ کرنے کی کوشش کی اس کا یہ خیال صحیح تھا کہ رجیت سنگھ کی وفات کے بعد ملک گیری کے لئے جو تنازعات ہو گئے اس وقت وہی شخص فائدے میں رہیگا جو اس قلعے پر قابض ہوگا۔ اس نے قلعے کے محافظین کو بہت سی رشوت دی اور مہاراجہ کے دستخط سے ایک جعلی حکم نامہ مرتب کیا جس میں قلعہ اس کے حوالے کیئے جانے کا حکم تحریر تھا۔ لیکن جعدار خوشحال سنگھ کو جو قلعہ دار تھا جعل کا شبہ ہوا اور اس نے یہ جواب کہلا بھیجا کہ اگر خود مہاراجہ بھی آجائے تو شب کے وقت قلعے کا دروازہ نہ کھولا جائیگا۔ اس طور پر اس سازش میں ناکامیابی نصیب ہوئی۔ مہاراجہ نے صحت پانے کے بعد جب اس واقعے کو سنا تو اس نے بدھ سنگھ کو تبدیلی آب و ہوا کے لئے کچھ دنوں ہزارہ بھیجنا مناسب سمجھا۔ یہاں اس نے نمایاں خدمات انجام دیئے اکوڑہ پر اس نے سید احمد شاہ کا مقابلہ کر کے انھیں شکست دی لیکن خود اس کے پانسو آدمی ضائع ہوئے۔ دوسرے دن وہ جگیرا کی جانب بڑھا جہاں ڈوگرے اور اٹاری کے سردار آکر اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اب کل فوج کی تعداد دس ہزار نفوس اور ۱۲ توپیں ہو گئیں۔ ان کے مورچوں کو سید احمد صاحب کی کثیر مگر غیر تربیت یافتہ فوج نے گھیر لیا جس میں کابلی یوسف زئی اور افغان شامل تھے۔ کچھ دن تک تو سکھ مورچوں میں دشمنوں کے متواتر حملے ہوا کیئے لیکن جب رسد ختم ہو گئی اور بدھ سنگھ کو تاب نہ رہی تو اس نے دشمنوں پر حملہ کر دیا اور سخت و خونخوار لڑائی کے بعد انھیں شکست دی۔ سید احمد شاہ نے یوسف زئی کی پہاڑیوں میں پناہ لی اور دو سال دم لینے کے بعد اس میں اس قدر رسکت ہوئی کہ پھر میدان میں آیا۔

مہاراجہ اور ہری سنگھ نلوا دونوں بدھ سنگھ کی مدد کو نکل کھڑے ہوئے لیکن یہ دیکھ کر کہ اب اس کو مدد کی ضرورت باقی نہ رہی انھوں نے افغان

صوبہ دار کو سید احمد شاہ کو ملک دینے کی پاداش میں سزا دینے کے ارادے سے پیشاور کا رخ کیا۔ شہر کو تاخت و تاراج کیا گیا۔ بالاحصار میں آگ لگا دی گئی مسجدیں سے بے ادبی کی گئی اور بہت سے اشجار جن کے لئے پیشاور کی وادی مشہور تھی کاٹ ڈالے گئے۔ ہمارا جہ خراج کی رقم میں اضافہ کر کے صوبہ دار یار محمد خاں کے فرزند کو بطور یغمال اپنے ہمراہ لے کر واپس لاہور روانہ ہوا۔

پیشاور اور سرحد میں سکھوں کے تعلق کا اظہار ان ہی متواتر لڑائیوں۔ حملوں اور محاصروں سے ہوتا رہا تا آنکہ ۱۲۳۷ء میں شاہ شجاع نے جس کا حقیقی اقتدار گوبرائے نام تھا لیکن اب تک وہ بادشاہ کے لقب سے موسوم تھا ملتان ڈیرہ جات اور پیشاور رنجیت سنگھ کے حوالے کر دیئے۔ اس عطیے پر قبضہ کرنے کے لئے دغا بازی یا زبردستی سے کام کرنا ضروری تھا۔ شہزادہ نونہال سنگھ اور سردار ہری سنگھ نوا آٹھ ہزار سپاہیوں کے ساتھ اضافہ شدہ خراج طلب کرنے کے بہانے سے شہر پر قبضہ کرنے کی غرض سے روانہ کیئے گئے۔ نونہال سنگھ نے دیواروں کے دیکھنے کے بہانے سے قبضہ حاصل کر لیا۔ باریق زئی سردار خلیف مقابلے کے بعد بھاگ گئے اور سکھوں کو وہ جگہ نصیب ہو گئی جس پر عرصے سے ان کا دانت تھا۔ لیکن افغانوں نے بغیر مقابلے کے قبضہ دینا گوارہ نہ کیا۔ ۱۲۳۵ء میں امیر دوست محمد خاں نے اس ضلع پر اس ارادے سے حملہ کیا کہ اس شہر کو پھر واپس ملے لیکن فقیر عزیز الدین نے جو اس غرض سے فوج کے آگے روانہ کیا گیا تھا کہ امیر کو بڑھنے سے روکے رہے ایسی کامیابی سے اس خدمت کو انجام دیا کہ سکھ فوج کثیر کے ساتھ آہنچے اور افغانوں کو ایسا محصور کر لیا کہ امیر کو دروں کے اُس طرف بھگت تمام فرار ہونا پڑا۔

سرحد کا مطیع کرنا سکھوں کی طاقت سے باہر تھا پیشاور پر قبضہ کرنے کے بعد نونہال سنگھ نے زبردستی ضلع بھر میں فوجی دورہ کیا۔ راستے بھر میں وہ آگ لگاتا لوٹ مار کرتا اور جس قدر محاصل دستیاب ہوئے انہیں وصول کرتا گیا۔ دیوان حاکم رائے جو ۱۲۳۹ء میں باغیوں کا سرغنہ تھا بنو۔ ٹانک۔ ڈیرہ اسماعیل خاں اور علی خیل کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ سکھوں کو اس وحشی ملک پر حقیقی حکومت کبھی

حاصل نہ ہوئی اور ان کا اقتدار قلعوں کی چار دیواریوں سے متجاوز نہ ہو سکا۔ انھیں کبھی بغیر مسلح فوج کے لگان وصول نہ ہوا۔ ہر دوسرے دوسرے سال بقایا وصول کرنے کے لیے فوج کا گزر اس ملک میں سے ہوا کرتا تھا۔ اس امر کی اطلاع جس طور پر ہوئی وہ بھی ایک لطیفہ ہے۔ لڑائی کے بعد ۱۸۴۷ء میں وزیر خزانہ راجہ دینا ناتھ نے انگریزی ریژیمینٹ کرنل لارنس کی توجہ ٹانک کے بقایا لگان کے جانب مبذول کراتے وقت بیان کیا کہ ”تقریباً دو سال کا لگان بقایا میں ہے اور اب فوج بھیجنے کا وقت آگیا ہے“۔

سردار ہری سنگھ نلوا پیشاور میں سپہ سالار کی حیثیت سے ٹھہرا۔ ۱۸۴۷ء میں اسے جہرود میں قلعہ تعمیر کرنے کا حکم دیا گیا جس سے دژہ ٹیبر کے دہانے کی حفاظت ہو سکے۔ یہ کام بہت جلد انجام پا گیا۔ گو یہ محکمہ نہ تھا لیکن آفریدیوں پر کافی طور پر دھاک بیٹھ گئی اور کابل سے آنے والی فوج کی روک تھام اس سے ہو گئی۔ امیر اس بات سے بہت برا فروختہ ہوا اور اس کی کوششانی سرحد پر اس طرح تعمیر کرنے سے جو چھپر چھاڑ کی گئی تھی اس پر وہ آمادہ جنگ ہو گیا۔

اس نے سات ہزار سوار دو ہزار بندوچی اور ۱۰ توپیں جلال آباد سے اپنے فرزند اکبر خاں کی سرکردگی میں روانہ کیں۔ اس کے اور تین فرزند بھی ساتھ ہو لیے اور راستے میں بیس ہزار جبرگے والے شریک ہو گئے۔ اپریل ۱۸۴۷ء کو یہ لوگ جہرود پہنچے جہاں صرف آٹھ سو سکھ بے سامان ورسد محافظت پر مامور تھے ہری سنگھ پیشاور میں بخار میں مبتلا پڑا تھا اس نے کوئی نقل و حرکت نہ کی۔ چھ دن تک بڑے سکون کے ساتھ محاصرہ برقرار رہا۔ اس عرصے میں دیوار میں اس قدر سوراخ ڈال دیئے گئے کہ سواروں کا دستہ اس میں سے گزر سکتا تھا۔ ایسے وقت میں جبکہ امید بالکل شقیع ہو چکی تھی ہری سنگھ اپنی تمام فوج چھ ہزار پیادے۔ ایک ہزار باقاعدہ اور تین ہزار بے قاعدہ سوار ہمراہ لیسکر پیشاور سے بغرض امداد چل کھڑا ہوا۔

کئی دن تک تو مخالف افواج آمنے سامنے پڑاؤ ڈالے رہیں اور کسی نے لڑائی آغاز کرنے کی خواہش نہ کی۔ بالآخر ہری سنگھ نے لڑائی کی ٹھانی پہلے پہل تو

اس کا حملہ ناقابلِ اندفاع ثابت ہوا اور افغانوں میں بے ترتیبی اور بھاگڑ بھیل گئی۔ لیکن جب سکھوں نے دور تک تعاقب کیا اس وقت افغان سواروں نے شمس الدین خاں کی سرکردگی میں اسے گھیر لیا۔ ہری سنگھ یہ دیکھ کر کہ سخت جدوجہد کے بغیر میدان ہاتھ سے جا رہا ہے اپنے خاص خاص سرداروں کے ساتھ فوج کے آگے آکھڑا ہوا اور اپنی موجودگی و طرزِ عمل سے سکھوں کی ہمت افزائی کر کے اس نے مقابلہ جاری رکھا۔ ایسی صورت میں فتح حاصل ہونے کی پوری توقع تھی لیکن ہری سنگھ کے پیٹ اور پسلیوں میں دو گولیاں ایسی لگیں جس سے وہ زخمی ہو کر گر پڑا۔ اس کے لشکر نے بدول ہو کر جبرود کی فصیل کی جانب راہ لی اور وہاں پہنچ کر امداد کا منتظر رہا۔ جب کھانا پانی بالکل ختم اور محصورین بالکل بے دم ہو گئے تو اس وقت بدہنجی۔ محصورین کو اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ جس طرح سے ہو سکے دشمن کی صفیں چیر کر باہر نکل جائیں۔ افغانوں کے حملے کی خبر جب پہلے پہل لاہور پہنچی تھی تو ایک کثیر فوج نو نہال سنگھ کی شادی کی تقریب میں جمع ہوئی تھی بجلت تمام شمال کی جانب روانہ کی گئی خود نہال سنگھ اس کا باپ کھڑک سنگھ جنرل و نٹو راجپور خوشمال سنگھ اور اور سکھ بہادر اس فوج کے ساتھ ہوئے اور یہ لشکر اس درجہ حبیب نظر آنے لگا کہ اس کے پیشاور میں بروقت پہنچنے پر بارق زئی سردار محاصرہ اٹھا کر بغیر کسی مقابلے کے جلال آباد کی جانب چلے گئے۔

اس پریشانی و مصیبت کے زمانے میں جہا راجہ نے انگریزوں کے ساتھ اتحاد پورے طور پر قائم رکھا انگریزی حکومت خود ناقص مشورے کی بنا پر افغانستان میں اس غرض سے مداخلت کرنا چاہتی تھی کہ اس بہادر و قابل خاندان کو معزول کریں جس نے بہت زور پکڑ رکھا تھا اور اس کے بجائے سدوزی خاندان کو جو نہایت کمزور اور اس میں کسی قسم کی انتظامی صلاحیت نہ تھی مامور کرے۔ اس سے قبل لاہور کے نامہ و پیغام سے رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع کے ساتھ جو انتظام کیا گیا۔ اس مہم کی کامیابی کے ساتھ آغاز اور اس کے انجام کے مصائب و آلام کا تفصیلی حال بیان کیا جا چکا ہے۔ اب یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ جہا راجہ کو یہ مہم بالخصوص ناگوار تھی۔ اسے یہ معلوم ہو گیا کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ جس طرح

اس سے قبل ستلج میں اس کا اقتدار محدود کیا گیا تھا اسی طرح اب سندھ و افغانستان میں محدود کر دیا جائے۔ لیکن پھر بھی اس نے سرکار انگریزی کی ان تجاویز کی تکمیل میں حتی الامکان امداد دی۔ جن کو سرولیم میکناٹن نے شت ۱۸۳۷ء میں اس کے سامنے بیان کیا تھا۔ وہ خود بھی اس مہم میں شریک ہونے پر تیار تھا بشرطیکہ اس کے سردار جنھیں انگریزوں کی اعانت بالخصوص ناگوار تھی اسے شرکت کی اجازت دیں کیونکہ اس وقت مہاراجہ کا ذاتی اقتدار برسرِ انحطاط تھا اور جھون کے راجاؤں دھیان سنگھ اور گلاب سنگھ کا اقتدار لاہور کے دربار میں برسرِ عروج تھا۔

موسم سرما ۱۸۳۸ء میں جبکہ سرکار انگریزی کا فوجی مرکز افغانی مہم کے لئے فیسروز پور میں قائم ہوا اور گورنر جنرل لارڈ آکلینڈ ٹرٹے ترک و احتشام سے لاہور میں مہاراجہ سے ملاقات کے لئے گیا تھا نجیت سنگھ پر کثرتِ مے نوشی۔ ہجوم افکار و انتشار کی وجہ سے فالج کا دوسرا حملہ ہوا جس نے گویا اسے اس امر سے متنبہ کیا کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہمیشہ کے لئے فتوحات سے رخصت ہو۔ فالج کے حملے کے دوسرے ہی سال اس کا انتقال ہو گیا۔ اس دورے کے بعد سے دم واپس تک وہ گویا اوجھلا ہو گیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ کاروبار انجام دینے کی کوشش کرتا رہا اور بعض اوقات فوجی پریڈ کے مواقع پر لاہور کے شہن بھج کے نیچے کے میدان میں بالکی میں پڑ کر جایا کرتا تھا۔ سب لوگ جانتے تھے کہ اب اس کا آخری وقت ہے اور تمام طاقتور سردار جو اب تک اپنے آقا کے خوف سے ایک دوسرے کی گردن دبانے سے باز رہتے تھے اس کشمکش کے لئے آمادہ ہو رہے تھے جس کا اس کی موت کے بعد پیش آنا لازمی تھا۔

انگریز ڈاکٹر متعدد بار اس کا معالجہ کر چکے تھے۔ ۱۸۲۶ء میں مرے اور ۱۸۳۲ء میں فالج کی شکایت ہونے کے بعد ایم گریگر نے اس کا علاج کیا تھا۔ لیکن ان کے نسخوں سے اسے کچھ فائدہ نہ معلوم ہوا کچھ تو بیماری کے علاج پذیر ہونے کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ اس نے شراب کی کثرت ترک نہ کی۔ بجلی کے دونوں طریقوں سے بھی اس کا علاج کیا گیا۔ ۱۸۳۶ء میں نونہال سنگھ کی شادی کی تقریب کے موقع پر سر ہنری فین کمانڈران چیف انگریزی عہدہ داروں کے

ساتھ شریک دعوت ہوا۔ اس ملاقات سے بجائے فائدہ کے نقصان پہنچا کیونکہ
 جہانداری کے خیال سے اس نے کثرت سے مے نوشی کی جس کی وجہ سے
 ۱۸۳۸ء میں اسے دوبارہ فالج کا دورہ ہوا۔ اس کی علالت کے زمانے میں
 فقیر عزیز الدین جو اس کا معتمد اور خاص حکیم تھا بڑی دلدہی سے مصروف علاج ہوا۔
 وہ اپنے ہاتھ سے اسے دوا پلاتا اور تمام خبریں سنایا کرتا تھا۔ دوسرے مشہور
 اطباء بھی طلبہ کیے گئے لیکن گونر جنرل نے جس ڈاکٹر کو روانہ کیا تھا اس کے زیر علاج
 ہونے سے اس نے قطعاً انکار کیا۔ دوا سے اس کا علاج ناممکن تھا جس طرح یونانی
 حکما کے مشک عنبر پیسے ہوئے موتی۔ صندل و بادام جو ہندوستانی قراواہین کی عمدہ
 اور ضروری دوائیں ہیں روک تھام ہو رہی تھی اس نے اپنے اکلوتے صلبی فرزند
 کھڑک سنگھ کو اپنے بستر مرگ کے قریب بلا کر اس کی جانشینی کا اعلان کیا اور
 دھیان سنگھ کو اس کا مدار المہسام نامزد کیا یہ بہت بڑی کامیابی تھی لیکن اس
 رو باہ فطرت کے نصیب میں اس سے شیعہ ہونا نہ بدلتھا۔ ننکانہ کے پوجاریوں اور
 غریبوں کو جہاں پہلا گرو پیدا ہوا تھا اور ڈیرہ بابا نانک کے پروہتوں کو جہاں
 بابا نانک کا انتقال ہوا تھا ۲۵ لاکھ روپے خیرات دینے کے بعد ہندوؤں اور
 سکھوں کی رسم کے مطابق اسے چار پانی سے اتار کر فرش پر لٹا دیا گیا اور
 ۲۷ جون ۱۸۳۹ء کو وہ راہی عدم ہوا۔

اس کے بعد چھ سال کی مدت فقہ و فساد اور ہنگامہ آرائیوں میں گزری
 جس میں قتل کا بازار گرم رہا اور غربانہایت بے رحمی سے پامال کیے گئے۔ خاندان کا
 وارث جائز کھڑک سنگھ جو نہایت بزدل اور کمزور تھا اور اس کا خوب صورت
 بے پروا اور اوباش فرزند نو نہال سنگھ دونوں وارث جائز قتل کیے گئے اور اس کے
 بد چھوٹے مدعیوں کی باری آئی۔ مہاراجہ شیر سنگھ کو جو ہمیشہ مخمور و مدہوش رہتا تھا
 مع اس کے فرزند کے سندھن والیوں نے قتل کر ڈالا۔ دلپ سنگھ کا بھی جو
 ایک کبھی کا بیٹا تھا بہت جلد قتل ہی انجام ہوتا لیکن قسمت نے یادری کی اور
 سکھ فوج کے شکست ہو جانے سے اسے سرکار انگریزی کا دامن عاطفت نصیب
 ہوا۔ جس کی مکافات اچھی نہ ہوئی۔

رنجیت سنگھ کے کشتِ عمل کا ثمرہ ملا۔ آباؤ اجداد نے کھٹے انگور کھائے
 اخلاف کے دانت کھٹے ہوئے جس مملکت کی بنیاد ظلم - دغا بازی اور خونریزی
 سے ہوئی وہ اپنے بانی کے بعد عرصے تک قائم نہ رہ سکی اوس کی بنیاد ایک
 شخص کی فوجی و ملکی قابلیت اوس کی جان تھی - اُس جان کے نکلتے ہی ریزہ ریزہ
 ہو کے خاک ہو گئی اور خالِ عہد کی وراثت انگریزوں کو نصیب ہوئی - اگر انگریز
 انصاف - سخاوت اور قوت سے حکومت کریں جو اوصاف بقائے سلطنت
 کے لئے لازمی ہیں تو وہ دوسرے حملہ آوروں سے او سے ہمیشہ کے لئے محفوظ
 رکھ سکیں گے فقط

تہمتِ بالِخیر

غلط نامہ

صفحہ	سطر	باب	غلط	صحیح
۱	۹	۱	آلہ جنگ	آلہ جنگ
۲	۳	۱	اتحاد پر	اتحاد پر
۳	۱۳	۱	نسلا بعد نسل	نسلا بعد نسل
۳	۲۰	۱	اُن کا محافظ اور نگہبان	اُن کا محافظ اور نگہبان
۴	۱۹	۱	جنھوں نے	جو
۶	۳	۱	صورت حال میں یہ نہ ہوتی	صورت حال یہ نہ ہوتی
۶	۵	۱	تیجہ کا سا بھوت	تیجہ کا سا بھات
۶	۷	۱	یہ قوت انگریزوں کی بڑھتی ہوئی	یہ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی قوت
۷	۲۴	۱	اکثر پیشین گوئی	اکثر جو پیشین گوئی
۱۱	۹	۲	جس کو	جن کو
۱۲	۹	۲	انگریزی حکومت	انگریزی حکومت کو
۱۲	۱۰	۲	نقص	نقص
۱۵	۲۱	۲	قدرتی طور سے پٹا کھایا	قدرتی طور برعکاس نے پٹا کھایا
۱۶	۷	۲	یقین کر لیتے	یقین کر لیتے ہیں
۱۶	۲۲	۲	۱۱	۱۱

صفحہ	سطر	باب	غلط	صحیح
۱۷	۱	۲	پر رہتی ہے	پر رہنے سے
۱۷	۲۱	۲	مہاراجہ کے	مہاراجہ نے
۱۷	۲۵	۲	ایک ورس	ایک اور ورس
۲۱	۸	۲	جیندہ	جیندہ
۲۱	۸	۲	کیپور تھلہ نے	کیپور تھلہ
۲۱	۲۴	۲	اپنے افسروں	اور اپنے افسروں
۲۴	۵	۲	کب	کیا
۲۷	۱۰	۳	ساوہوں کا ساتھ	ساوہوں کا ساتھ
۳۲	۱	۳	تلونڈی مقام پر	تلونڈی کے مقام پر
۳۷	۱۰	۳	اس مسئلہ	اس میں مسئلہ
۴۲	۷	۳	اپنے قوت بازو	اپنی قوت بازو سے
۴۳	۲۳	۳	نہیں دیتے	نہیں دیتی
۴۹	۱۰	۳	کی مانع سمجھی جاتی تھی	کا مانع سمجھا جاتا تھا
۵۰	۸	۴	ایرانی ہو	ایرانی ہوں
۵۰	۱۵	۴	طاقتور ہو جو	طاقتور ہو
۵۰	۱۸	۴	بار ساز و سامان	باساز و سامان
۵۳	۵	۴	ہر دونوں کو	دونوں کو
۵۴	۲۱	۴	رنجیت سنگھ کو بیاہ دی تھی	رنجیت سنگھ کو ۱۸۴۱ء میں بیاہ دی تھی
۶۰	۸	۴	دیا جاتا	دیا جاتا
۶۱	۸	۵	کوئی ایسی بات	ایک ایسی بات
۶۱	۹	۵	جاں جو کھوں	جان جو کھوں
۶۱	۱۴	۵	وہ اپنی علی ذہانت	وہ اپنی اعلیٰ ذہانت
۶۴	۲۳	۵	صلہ دیے	صلہ دینے
۶۵	۲۲	۵	ہے	ہیں
۶۷	۵	۵	استشنا تھا وہ	استشنا تھا تو وہ

صفحہ	باب	غلط	صفحہ
خیالی بزرگ	۵	خیالی بزرگ	۶۰
پیشاوردی	۵	پیشاوردی	۶۳
خیانت کی	۶	خیانت	۶۸
انتخاب کیا تھا	۶	انتخاب کیا جاتا	۶۸
جیندہ	۶	جیندہ	۸۰
مرتبہ تحریرات	۶	مرتبہ تحریرات	۸۴
دکھا دے	۶	دکھا دیا	۸۴
مہاراجہ کا	۶	مہاراجہ جسکا	۸۷
راجہ وینا تھا اور	۶	راجہ وینا تھا اور	۸۹
لہنا سنگھ کو حسام الدولہ	۶	لہنا سنگھ حسام الدولہ	۹۲
شکلیں ظاہر ہوتی تھیں	۶	شکلات ظاہر ہوتے تھے	۹۲
لکھا ہوا تھا کبھی	۶	لکھا ہوا تھا کبھی	۹۲
۱۸۰۹ء میں	۷	۱۸۰۹ء	۹۵
تسفر کرنے نے	۷	تسفر کرنے	۹۶
اپنے دوست	۷	اپنے ست	۹۹
قریب (تھی)	۷	قریب (تھی)	۱۰۰
اور حکومت	۷	و حکومت	۱۰۰
باندھے زرق برق	۷	باندھے زرق برق	۱۰۲
زراعتوں تک کو	۷	زراعتوں تک	۱۰۴
وقتی	۷	وقتیہ وقتی	۱۰۵
دیکھنا چاہئے	۷	دیکھا چاہئے	۱۰۱
نودہ سنگھ	۸	نودہ سنگ	۱۱۰
دریائے جہلم کی سلاب کے وقت	۸	دریائے جہلم کی سلاب کے وقت	۱۱۶
کاٹھ سنگھ نے جو	۸	کاٹھ سنگھ جو	۱۱۹
شاہ درے	۸	شاہ درے	۱۱۹

صفحہ	سطر	باب	غلط	صحیح
۱۲۱	۱۱	۹	بے مالک	بے مالک
۱۲۱	۱۹	۹	نذرہ سرکار انگریزی	سرکار انگریزی
۱۲۲	۹	۹	بررسی	بررسی
۱۲۳	۲۱	۹	اسکے صلح	اس سے صلح
۱۲۴	۲۳	۹	خانہ	خانہ
۱۲۴	۲۴	۹	دیہاتوں	دیہاتیوں
۱۲۴	۲۵	۹	قطعہ مالک	قطعہ ملک
۱۲۶	۱۴	۹	ملکے اور	مل کے
۱۲۸	۱۵	۹	قرینے	دینے
۱۳۰	۱۸	۹	بالکلیتہ	بالکلیہ
۱۳۱	۴	۹	اسکے	اسکے
۱۳۴	۱۶	۱۰	کی بھی	کی تھی
۱۳۵	۲۰	۱۰	سکھ فوج سے	سکھ فوج نے
۱۳۶	۲۲	۱۰	کھڑا اور	کھڑا رہا اور
۱۳۷	۱	۱۰	پرسفید ریش	سفید ریش
۱۳۸	۶	۱۰	روسی پہاڑی	دوسرے پہاڑی
۱۳۹	۸	۱۰	دوست محمد خاں	دوست محمد خاں نے کیا
۱۴۲	۲۳	۱۰	یہ مہم کا انجام تباہی	اس مہم کا انجام تباہی تھا
۱۵۱	۱۸	۱۰	اکثر ان پر	اکثر ان پر
۱۵۷	۲	۱۰	مسجدوں سے	مسجدوں کی
۱۶۰	۹	۱۰	لارڈ اکلینڈ ٹرے	لارڈ اکلینڈ بڑے
			تمست	

